طلوع اسلام

اپریل سنہ ۱۹۵۷ء

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماھنامہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدل اشتراک:
ھندوستان اور پاکستان سے سالانہ آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ ۱۴ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان میں
بارہ آنے

ٹیلیفون نمبر: ۴۱۴۸۸
خط وکتابت کا پتہ: ۱۵۹/۳ - ایل
پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی۔ کراچی ۲۹

جلد ۱۰	اپریل سنہ ۱۹۵۷ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

لمعات		۳ — ۶
رابطۂ باہمی	(سکرٹری مرکزی بزم طلوع اسلام)	۷ — ۸
قانونِ شریعت	(علامہ اقبالؒ)	۹ — ۴۰
روحی کا مسئلہ اقبال کی نظر میں		۴۱ — ۴۹
اقبال کے تصورات		۵۱ — ۶۰
دُرِ منثور		۶۱ — ۶۹
روزہ کے احکام		۷۰ — ۷۴
اشتہارات		

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

غالب نے جب کہا تھا کہ

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا۔ کیجئے ہائے ہائے کیوں

تو اس نے ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ کسی کی موت پہ پہلے آنسو تو وہ ہوتے ہیں جو ہنگامی طور پر بے اختیار نکل پڑتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد اس کی یاد میں آنسو وہی بہاتا ہے جو اسکی کمی محسوس کرتا ہے۔ جتنی شدید اس کی کمی ہو۔ اتنی ہی گہری اس کی یاد ہوتی ہے اور جس جس مقام پر اس کی کمی نمایاں ہوتی ہے اُسی مقام پر آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔

اُنیس سال کا عرصہ ہوا' علامہ اقبال ہم سے رخصت ہو گئے۔ اور ہنگامی طور پر ساری قوم کی آنکھیں بایں نمط اشکبار ہو گئیں کہ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ ایسا ماتم شاید ہی کسی اور کی موت پر ہوا ہو گا۔ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اقبال ملت کا دھڑکنے والا دل تھا۔ اس کے رک جانے سے قوم کی نبضِ ہستی ساکت ہو جانی چاہیئے تھی۔ لیکن اس کے بعد قوم کے آنسو خشک ہونے لگ گئے' اور اب ان کی آنکھیں اس طرح بے نم ہو گئی ہیں کہ کسی کو خیال تک بھی نہیں گذرتا کہ انہی آنکھوں سے کبھی خون کے آنسو ٹپکے تھے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ قوم کو اس کا احساس ہی نہیں کہ

"غالبِ خستہ کے بغیر کون (کون) سے کام بند ہیں۔

جن قوموں میں زندگی کا صحیح نظام قائم ہو' ان میں افراد کی موت سے کوئی کام بند نہیں ہوتا۔ افراد آتے ہیں اور افراد جاتے ہیں' لیکن وہ نظام اپنے زورِ دروں سے بدستور آگے بڑھے چلا جاتا ہے۔ لیکن جن قوموں میں نظامِ زندگی مفقود ہو' ان میں کسی زندہ (یعنی صحیح معنوں میں زندہ اور زندگی بخش) فرد کی موت ——— اور ایسے وقت میں موت جب کہ اس کا مشن ابھی ناتمام ہو ——— بہت بڑا سانحہ ہوتا ہے۔ ایسی اقوام میں دیدہ ور افراد پیدا ہی بڑی مشکل سے ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی ایسا فرد اپنے پیشِ نظر مقصد کی تکمیل سے پہلے مر جائے تو یہ اس قوم کی انتہائی بدبختی ہوتی ہے۔ لیکن اس بدبختی

کا احساس تو اُسے ہی ہو سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ

"غالبِ خستہ کے بغیر کون (کون) سے کام بند ہیں"

ہماری قوم نے اقبال کو ایک شاعر سمجھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ شاعر کے بغیر قوم کا کوئی کام رکا نہیں رہتا۔ اس لئے اگر اقبال کی یاد میں قوم کے دل سے ہوک نہیں اٹھتی تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس میں قصور قوم کا نہیں۔ قصور ان کا ہے جنہوں نے قوم کو بتایا ہی نہیں کہ اقبال کیا تھا اور کیا کرنا چاہتا تھا۔

علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ ۱۹۳۲ء) کے صدارتی خطبہ میں کہا تھا کہ

جو قومیں فکر سے عاری ہو جاتی ہیں۔ تباہ ہو جاتی ہیں۔

اقبال کی موت سے، قوم فکر سے محروم ہو گئی۔ اور یہ قوم کا اتنا بڑا نقصان تھا جس کی تلافی نہیں ہو سکی۔ اقبال کی فکر نے قوم کو پاکستان کا تصور دیا۔ یہ اتنی بڑی نعمت تھی جس کی مثال ہماری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ لیکن جب پاکستان حاصل ہوا تو قوم اُس فکر سے محروم ہو چکی تھی۔ اس فکر کی محرومی سے قوم کی حالت کیا ہوئی ہے، اس کا اندازہ وہی آنکھیں لگا سکتی ہیں جنہیں خدا نے بینائی عطا کی ہے۔ حصولِ پاکستان کے بعد سب سے پہلا مسئلہ دستورِ پاکستان کی تدوین کا تھا۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے کامل نو برس تک قوم ایک راہ گم کردہ مسافر کی طرح جس بُری طرح سے مصروفِ دشت پیمائی رہی ہے اس سے بنی اسرائیل کی چالیس سالہ صحرا نوردی کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ پھر اس نو سالہ دشت پیمائیوں کے بعد اس نے جو دستور مرتب کیا ہے اسے دیکھ کر ہر وہ آنکھ پُرنم ہو جاتی ہے جو یہ جانتی ہے کہ اقبال نے پاکستان کا تصور کس مقصد کے لئے دیا تھا۔ اگر حصولِ پاکستان کے وقت اقبال زندہ ہوتا تو وہ نو سال نہیں نو دنوں میں بتا دیتا کہ اس کا دستور کن خطوط پر تشکیل ہونا چاہیئے۔ اور جب وہ دستور مرتب ہوتا تو دنیا پکار اٹھتی کہ ـــــ اماتو چیزے دیگری۔

دستورِ پاکستان کے بعد اب قوم کے سامنے قانون سازی کا مرحلہ آیا ہے اور ایسا نظر آتا ہے کہ جو کچھ دستور سازی کے سلسلہ میں ہوا تھا وہی کچھ قانون سازی کے ضمن میں ہوگا۔ حکومت نے اس مقصد کے لئے ایک کمیشن کی تعیناتی کا اعلان کر رکھا ہے۔ ان سطور کی تسوید کے وقت تک اس کمیشن کے عناصرِ ترکیبی کا اعلان نہیں ہوا۔ لیکن اندازہ یہی ہے کہ اس میں یا تو ماڈرن طبقہ کے ایسے نمائندے ہوں گے جن کے ذہن میں سکولر انداز کے ضابطۂ قوانین کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اور یا ہمارے قدامت پرست اربابِ شریعت ہوں گے جنہیں اس کا احساس ہی نہیں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں اور زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ کسی اسلامی مملکت کی آئین سازی ہو یا قانون سازی۔ اس کے لئے وہی افراد موزوں ہو سکتے ہیں جن کی نگاہیں قرآن کریم کے ابدی اصولوں پر اور انگلیاں نبضِ زمانہ پر ہوں۔ ہماری تاریخ میں (یعنی امتِ مسلمہ کی تاریخ میں) یہ پہلا موقع ہے کہ کسی مملکت نے اس کی کوشش کی ہو کہ ہمارے قوانینِ شریعت ایک ضابطہ (CODE) کی شکل میں مرتب ہو جائیں۔ اس وقت جسے ہم قانونِ شریعت کہتے ہیں وہ متفرق فتاوے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور وہ فتاوے بھی اس زمانے

گئے ہیں جس کے تقاضے ہمارے دور کے تقاضوں سے یکسر مختلف تھے۔ اگر ہماری حکومت نے ہوشمندی اور جرأت سے کام لیا اور قانون سازی کا کام ایسے افراد کے سپرد کیا جو روحِ اسلامی کی روشنی میں عصرِ حاضر کے تقاضوں کا مطالعہ کر سکتے ہوں تو ہمارا کاروانِ ملت زندگی کی صراطِ مستقیم پر گامزن ہو سکے گا۔ لیکن اگر اس نے اس ضمن میں بھی وہی روش اختیار کی جو آئین سازی کے سلسلہ میں اختیار کی گئی تھی تو ہمارا شمار انہی میں ہوگا جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ـــ جَهَنَّمَ (۱۴/۲۸) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جنہوں نے خدا کی دی ہوئی نعمت کی ناسپاس گذاری کی اور اپنی قوم کے کاروان کو تباہی کی منزل میں جا اتارا۔ یعنی جہنم میں!

گذشتہ اشاعت کے لمعات میں ہم نے اسلامی مملکت کی قانون سازی کے سلسلہ میں کچھ اشارات پیش کئے تھے۔ یہ شمارہ چونکہ علامہ اقبال کی یاد میں شائع ہو رہا ہے۔ اس لئے اسے انہی کے کوائف کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے، خطباتِ تشکیلِ جدیدہ سے، اس باب کا رواں ترجمہ پیش کیا گیا ہے جس میں علامہ مرحوم نے خصوصیت سے اس موضوع سے بحث کی ہے۔ اس خطبہ کے مطالعہ کے بعد آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اس سلسلہ میں ان کے تصورات کیا تھے (اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اس مقالہ کو الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا جا رہا ہے) اس کے بعد باقی اوراق میں علامہ مرحوم کی نثر و نظم کے بہت سے ٹکڑے پیش کئے جا رہے ہیں جو زندگی کے اہم گوشوں کے متعلق ان کے تصورات کے مظہر ہیں۔ ان میں سے بعض چیزیں ۱۹۵۵ء میں ہفتہ وار طلوعِ اسلام میں آ چکی ہیں۔ لیکن اکثر احباب نے اس وقت شکایت کی تھی کہ ہفتہ وار طلوعِ اسلام کا سائز ایسا تھا کہ ان پرچوں کی جلد بندی سے انہیں محفوظ رکھنا دشوار تھا۔ لہٰذا ہم نے انہیں دوبارہ شائع کر دیا ہے تاکہ صاحبِ ذوق احباب انہیں محفوظ رکھ سکیں۔ آپ ان گہر ہائے درخشندہ کو دیکھ کر یقیناً ہم سے متفق ہوں گے کہ علامہ اقبال نے کس قدر صحیح کہا تھا کہ

پس از من شعرِ من خوانند و می یابند و می گویند

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

ہماری آنکھیں جو اقبال کی یاد میں اب تک شبنم فشاں ہیں تو اس کی یہی وجہ ہے۔ کہنے والے نے انہی جیسوں کے متعلق کہا تھا کہ

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختہ
چو من از دودۂ آتش نفساں می خیزد　　(غالب)

طلوعِ اسلام اپنی اس سعادت پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے کہ جس چراغ کو علامہ اقبال نے اپنے خونِ جگر سے

روشن کیا تھا، اس لئے اسے زندہ ہی نہیں رکھا بلکہ اسکی روشنی کو دور دراز گوشوں تک بھی پھیلایا ہے۔ اس لئے نہیں کہ طلوع اسلام شخصیت پرستی کا قائل ہے (جبکہ وہ تو اس کا سخت مخالف ہے) بلکہ اس لئے کہ یہ شمع قرآن کی روشنی کے عام کرنے کا موجب ہے۔ اور ہمارا مقصد قرآن کی روشنی کو عام کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس مقام پر ہمیں خود حضرت علامہ سے اختلاف ہوتا ہے ہم اس کے اظہار میں بھی ذرا تامل نہیں کرتے۔ یہی وہ راہ ہے جس کی طرف قرآن راہ نمائی کرتا ہے۔ اور اسی کی راہ نمائی، بس ایک راہ نمائی ہے۔ ان ھدی اللہ ھو الھدیٰ۔

پرچہ پریس میں جا رہا تھا کہ حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ مجوزہ لا کمیشن کے لئے عدالت عالیہ کے جج جسٹس محمد شریف صاحب کو بطور چیرمین مقرر کیا گیا ہے اور ارکان کمیشن کا تقرر ان کے مشورہ سے ہوگا۔ ہمیں اس سے اطمینان ہوا کہ چیرمین کے انتخاب میں حکومت نے بالغ نظری سے کام لیا ہے۔ جسٹس شریف صاحب کی قانونی قابلیت تو ان کے موجودہ منصب سے ظاہر ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے وہ اسلامیات سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں اور (اقبال کے الفاظ میں)

نے ابلہ مسجد ہیں نہ تہذیب کے فرزند

ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے اہم فریضہ کی سرانجام دہی میں کامیاب رہیں گے۔

لیکن (یہ بظاہر ہے کہ) کمیشن کی کامیابی کا دارومدار اسکی ہیئت ترکیبی پر ہے۔ اور چونکہ اب کمیشن کے ارکان کے انتخاب میں جسٹس شریف صاحب کے مشورہ کو بھی دخل ہوگا اسلئے ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی ذمہ داری اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ کمیشن کے ممبر کونسے افراد ہوں گے۔ لیکن ہم اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کی بنیادی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ان حضرات کو کمیشن کا ممبر قطعاً نہیں ہونا چاہیئے جو پاکستان میں سیکولر انداز کی حکومت چاہتے ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ علمی قابلیت کے علاوہ، ان حضرات کی ذہنیت کا پیش نظر رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ حکومت نے اعلان کیا تھا کہ اس کمیشن میں ملک کے مختلف مکاتب فکر کے ارباب فکر و نظر کو شامل کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے اس کمیشن میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے نمائندے بھی ہوں گے اور وہ ارباب فکر بھی جو فرقوں سے بلند ہو کر خالص اسلامی نقطہ نگاہ سے حالات کا مطالعہ کرتے اور مملکت و ملت کے تقاضوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ جہاں تک فرقوں کے نمائندوں کا تعلق ہے، یہ ظاہر ہے کہ وہ قدامت پرست ہوں گے۔ اسلئے کہ قدامت پرستی اور فرد پرستی ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں لیکن انفرادی افتاد طبع کے اعتبار سے اس طبقہ میں ایسے حضرات بھی ہیں (اور بدقسمتی سے اکثریت ایسے ہی حضرات کی ہے) جو دوسروں سے نفرت اور تنگ نظری کو حمیت دینی، تخریبی ہنگامہ خیزیوں کو اسلام کی خدمت۔ دل آزاری اور دشنام طرازی کو حق گوئی و بیباکی۔ اور فی سبیل اللہ فساد کو جہاد قرار دیکر اپنا بازار گرم رکھتے ہیں اگر کمیشن میں ایک بھی اس ذہنیت کا حامل آگیا تو وہ مچھر کی طرح کسی کو بھی آرام کی نیند سونے نہیں دے گا۔ کمیشن میں ایسے لوگوں کو لینا چاہیئے جو ہنگامی جذبات سے الگ ہٹ کر مسئلہ زیر نظر پر علمی انداز سے (Academically) سوچنے اور بات

کرنے کے اہل ہوں، جو اپنی ہی نہ کہے جائیں بلکہ دوسروں کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے Appreciate کرنے) کی بھی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جو اپنی ہمہ دانی کے زعم میں یونہی پھنکارتے نہ پھریں بلکہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ دین کی سمجھ بوجھ کسی ایک فرد کی اجارہ داری نہیں ہے، دوسروں کو بھی مل سکتی ہے۔ فرقہ پرست حضرات سے اس کی توقع تو نہیں کی جا سکتی کہ وہ اسکے معترف ہوں کہ ان کے فرقے سے باہر بھی کوئی مسلمان صحیح راستہ پر ہو سکتا ہے لیکن وہ دوسروں کو کم از کم انسان تو سمجھیں۔ جہاں تک علمی قابلیت کا تعلق ہے، ان میں اس قسم کا تو شاید ہی کوئی ہو جو علوم حاضرہ میں بھی دستگاہ رکھتا ہو لیکن یہ حضرات ایسے بھی تو نہ ہوں جنھیں (اکبر مرحوم نے) "چاہ زمزم کے مینڈک" کہا تھا۔ ان کی نگاہیں کچھ تو عصرِ رواں کے تقاضوں پر ہوں۔ اگر کمیشن میں اس قسم کے حضرات لئے گئے تو توقع کی جا سکتی ہے کہ انکی کوشش اور تعاون سے کچھ نہ کچھ تعمیری کام ہو سکے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو نہ صرف یہ کہ یہ تمام محنت رائگاں جائے گی بلکہ اس سے ایسے نتائج مرتب ہوں گے جن کی مضرت رسانی بہت دوررس ہوگی۔

امید ہے کہ لا کمیشن کے چیرمین اور دیگر متعلقہ ذمہ دار حضرات ہماری ان گذارشات کو درخورِ اعتنا سمجھیں گے۔ ہم ان کی (اور جو حضرات بطور ارکان مقرر ہوں ان کی) خدمت میں ایک بار پھر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جو فریضہ ان کے سپرد کیا جا رہا ہے وہ بڑا اہم، مشکل اور نازک ہے۔ ہم تاریخ کے نازک ترین دور میں سے گذرتے ہوئے زندگی کے ایک ایسے دوراہے پر آکھڑے ہوئے ہیں جہاں سے اگر ہمارا ایک قدم بھی غلط سمت اٹھ گیا تو معلوم ہمارا کاروانِ ملت کہاں سے کہاں جا پہنچے گا۔ اسلئے جن حضرات کے ذمے اس قافلہ کی راہنمائی کا کوئی کام بھی سپرد ہو انھیں بڑے حزم و احتیاط سے قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اسمیں شبہ نہیں کہ کمیشن کا دائرہ عمل بہت محدود ہے لیکن ان حدود کے اندر بھی بڑی حد تک مفید کام ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر اس کمیشن نے اس محدود دائرہ میں اطمینان بخش نتائج مرتب کر دکھائے تو اسکے عمل و اختیارات کے دائرہ کو زیادہ وسیع کر دیا جائے۔ لیکن یہ اطمینان بخش نتائج اسی صورت میں مرتب ہو سکتے ہیں کہ کمیشن کے ارکان جو قدم اٹھائیں، خدا کی کتاب منیر کی روشنی میں اٹھائیں کہ وہی نورانی قندیل اس قافلہ کو منزلِ مقصود تک لے جا سکتی ہے۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تو دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں ہمارے حصے میں آئیں گی۔ اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو خدا کا قانونِ مکافات ہمیں جھٹک کر الگ کر دے گا اور ہماری جگہ کوئی اور قوم لے لیگی جو (قرآن کے الفاظ میں) ہماری طرح نہیں ہوگی۔ ویلیت مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا۔ اقبال کے الفاظ میں۔

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است	سازِ قرآں را نواہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر	آسماں دارد ہزاراں زخمہ در
ذکرِ حق از امتاں آمد غنی	از زمان و از مکاں آمد غنی
حق اگر از پیشِ ما بردارد ش	پیشِ قومے دیگرے بگذاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن	ہر زماں جانم بلرزد در بدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند	آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند!

رابطۂ باہمی

جملہ بزمہائے طلوع اسلام کی خدمت میں

طلوع اسلام کی پہلی کونشن میں آپ کے نمائندگان شریک ہوئے۔ انھوں نے وہاں کچھ عزائم کا اظہار فرمایا (جنھیں ریزولیوشنز کہتے ہیں)، کچھ مقاصد اپنے سامنے رکھے۔ ان کے حصول کے لئے لائحہ عمل تجویز کیا۔ اور ان تمام عزائم و مقاصد کو اپنے سینوں میں لئے، باچشم نم کونشن سے رخصت ہوئے۔

کونشن کے انعقاد پر چار ماہ سے زائد کا عرصہ گذر چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے ان مقاصد کے حصول کے لئے اس وقت تک کیا کیا ہے؟

جب محترم پرویز صاحب کے سامنے کونشن کی تجویز رکھی گئی تھی تو انھوں نے فرمایا تھا کہ آپ ان اجتماعات کی طرح تو ڈال رہے ہیں لیکن مجھے خدشہ ہے کہ بزم طلوع اسلام کہیں 'بزم مشاعرہ' بن کر نہ رہ جائے۔ آپ سوچئے کہ ہماری بے عملی اور دون ہمتی کہیں اُن کے مزعومہ خدشہ کو حقیقت نہ بنا دے۔ جو پروگرام ہم نے اپنے سامنے رکھا تھا اس میں سب سے اہم شق یہ تھی کہ عوام سے زیادہ سے زیادہ رابطہ پیدا کیا جائے۔ اور خدمتِ خلق کو ہر فریضہ پر مقدم سمجھا جائے۔ سوچئے کہ ہم نے اس باب میں اب تک کیا کیا؟

دوسری شق یہ تھی کہ قرآنی فکر کی عام اشاعت کے سلسلہ میں، ادارہ کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ زیادہ سے زیادہ تقسیم کئے جائیں اور عوام کو ان کا مفہوم ذاتی طور پر بھی سمجھایا جائے۔ غور کیجئے کہ اس سلسلہ میں ہم نے کیا کیا ہے؟

تیسری شق مرکزی فنڈ کا جمع کرنا تھا تاکہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا دائرہ وسیع ہو جائے۔ محاسبہ کیجئے کہ اس ضمن میں کتنا کچھ کیا جا چکا ہے؟

ایک قابلِ غور تجویز

بہت سے احباب کی تجویز یہ ہے کہ محترم پرویز صاحب کے ہفتہ وار درس قرآن کو tape-Recorder) میں محفوظ کر کے (Tapes) باری باری مختلف بزموں کو بھیجے جائیں تاکہ یہ تقاریر دوسرے مقامات پر سنائی جا سکیں۔ آپ مطلع فرمائیں کہ

(ا) کیا آپ کے ہاں (Tape-Recorder) ہے جس پر ان تقاریر کو (peproduce) کیا جا سکیگا؟

(ii) اگر ریکارڈر ہے تو وہ کس (Make) کا ہے کیونکہ ایک ریکارڈر پر ریکارڈ کی ہوئی تقریر ہر (Make) کے ریکارڈر پر نہیں سنی جا سکتی۔

اطلاعات

بحمد اللہ مرکزی بزم کے زیر اہتمام ایک عربی کلاس کھولدی گئی ہے جس میں جدید سائنٹفک طریق سے عربی کی تعلیم

دی جاتی ہے ہفتہ میں دو دفعہ کلاس کا اجتماع ہوتا ہے۔ اور اندازہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ میں اس قدر عربی سکھائی جا سکیگی جس سے قرآن کریم بآسانی سمجھ میں آسکے۔ کلاس میں قریب پچاس احباب شامل ہوتے ہیں۔

۲۔ بزم طلوع اسلام لاڑکانہ کے سکریٹری اطلاع دیتے ہیں کہ بزم خواتین کی تشکیل کے لئے کوشش کی جارہی ہے اور پمفلٹ "پاکستانی عورت تیری منزل کہاں ہے؟" کو منظم طریقہ سے تعلیم یافتہ خواتین میں تقسیم کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔

۳۔ بزم طلوع اسلام پشاور کے ترجمان اطلاع دیتے ہیں کہ عنقریب لائبریری کا قیام عمل میں آجائے گا۔ فی الحال قصہ خوانی بازار میں عبدالمجید صاحب کی دوکان پر قرآنی مطبوعات رکھے گئے ہیں جہاں سے ہر صاحب ذوق مطالعہ کرسکتا ہے۔ قرآنی پمفلٹ اسکولوں اور کالجوں میں منظم طریقے سے تقسیم کئے گئے ہیں۔

۴۔ بزم طلوع اسلام منٹگمری کے ترجمان لکھتے ہیں کہ ان کے اراکین نے قصبوں میں خدمت خلق کا کام شروع کردیا ہے۔ نیز قرآنی پمفلٹ تقسیم کئے جاتے ہیں اور لوگ اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہفتے میں ایک بار کسی نہ کسی قصبے میں قرآنی فکر کی اشاعت کی جاتی ہے۔

۵۔ بزم طلوع اسلام جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں کے ترجمان لکھتے ہیں کہ ان کے ہاں دارالمطالعہ قائم ہے جس سے عام پبلک مستفید ہو رہی ہے۔ بزم خواتین کی تشکیل کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور قرآنی مطبوعات باقاعدگی سے لوگوں تک پہنچائی جاتی ہیں۔

۶۔ بزم طلوع اسلام مردان کے سکریٹری لکھتے ہیں کہ دارالمطالعہ کے لئے جگہ کرائے پر لے لی گئی ہے۔ جس میں تمام قرآنی مطبوعات اور دیگر کتب موجود ہیں اور جس سے کافی اصحاب مستفید ہو رہے ہیں قرآنی پمفلٹ کی تقسیم کے لئے سلسلہ قائم ہے۔ بعض پمفلٹوں کا پشتو ترجمہ عنقریب شائع کیا جائے گا۔ بزم میں گذشتہ چھ سال سے قرآن کا درس ہوتا تھا جو اب ختم ہوا ہے۔ اب اس کو دوبارہ شروع کیا جائے گا۔

(۷) مرکزی بزم (کراچی) کے دفتر میں غریبوں اور نادار دں کو طبی اور قانونی مشورہ مفت دینے کا انتظام کیا گیا ہے۔

تاکید (۱) بزم ہائے طلوع اسلام سیالکوٹ۔ راولپنڈی۔ دینا منڈی۔ دینا جلیانی۔ مظفر گڈھ۔ راولاکوٹ کلری۔ ملتان۔ گجرانوالہ سے درخواست ہے کہ آپ اپنی ماہوار رپورٹ مرکزی دفتر کو باقاعدگی سے بھیجا کریں۔ کافی مدت سے آپکے ہاں کی کوئی خبر نہیں ملی۔

(۲) تمام بزموں سے درخواست ہے کہ اپنے حلقوں کے اراکین کی فہرست معہ پتہ اور دیگر ضروری معلومات، مرکزی دفتر کو بہت جلد بھیج دیں۔

سکریٹری مرکزی بزم طلوع اسلام
۱۲۵۔ خلیق منزل۔ گارڈن ویسٹ۔ کراچی نمبر ۳

باسمہ تعالیٰ

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر
بانگاہِ دیگرے اور انگر

اسلامی مملکت میں

قانونِ شریعت

کس طرح مُرتب ہوگا؟

(علامہ اقبالؒ)

شائع کردہ:- ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کراچی

اسلامی قانونِ شریعت میں اصولِ ارتقاء

(علامہ اقبالؒ)

[جیسا کہ طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں لکھا جا چکا ہے، اس وقت پاکستان کے سامنے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ تدوینِ فقہ کے لئے حکومت کی طرف سے جو کمیشن مقرر کیا گیا ہے، اُسے کون سے اصولِ اساسی کے مطابق کام کرنا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کی اہمیت صرف پاکستان تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ پورے کے پورے عالمِ اسلامی کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اسلئے کہ جو ملک بھی اسلام کے ساتھ اپنی نسبت رکھتا ہے اسکے سامنے زہ یا بدیر، یہ سوال آئیگا کہ اسلام میں قانون سازی کا بنیادی اصول کیا ہے؟ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی مملکت نے ایک خاص کمیشن اس مقصد کیلئے مقرر کیا ہو کہ وہ ملک کے توانین کو اسلامی قوانین کے مطابق وضع کرے۔ اس کمیشن کی کوششوں کے نتائج دنیا کے سامنے اس حقیقت کو پیش کرینگے کہ اسلام میں اس کی صلاحیت ہے کہ یہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے۔ یا یہ بھی (دوسرے مذاہب کی طرح) انسانیت کو تاریخ کے ایک مقام پر روک کر کھڑا کر دینے کا موجب ہے؟ قدامت پرست طبقہ کا عقیدہ و مسلک یہ ہے کہ انسانی تقاضوں کے متعلق جو فیصلے اس سے پہلے ہو چکے ہیں، اُن میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جا سکتا۔ بالفاظِ دیگر ان کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانیت تاریخ کے ایک خاص دور میں جس مقام تک پہنچ چکی تھی اُسے اُس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ نہ صرف قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم کے خلاف ہے بلکہ پوری کی پوری انسانیت کا بھی دشمن ہے۔ قرآن نے نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ اس سے انسانیت ان اطواق و سلاسل سے آزاد ہو جائے گی جن میں وہ جکڑے چلی آ رہی تھی۔ اس کے لئے وہ قدم قدم پر عقل و فکر اور غور و تدبر پر زور دیتا ہے۔ قدامت پرستی کا یہ مسلک، ایک عرصۂ دراز سے تمام عالمِ اسلامی پر چھائے چلا آ رہا ہے۔ ترکوں نے سب سے پہلے اس کابوس کو سینے سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے ان کے ہاں کوئی ایسا صاحبِ بصیرت نہیں تھا جو تاریخ کے ایسے نازک وقت میں یہ بتا سکتا کہ انھیں تجدیدِ معاشرہ کی کوشش قرآن کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے کرنی چاہیئے۔ یہ سعادت ہندوستان کو حاصل ہوئی کہ یہاں (تشکیلِ پاکستان سے بہت پہلے سے) ایسے اربابِ فکر و نظر پیدا ہوئے جنہوں نے قرآنی فکر کو عام کر کے یہ بتایا کہ اسلام میں قانون کا سرچشمہ کتاب اللہ ہے۔ ان طالع مند اربابِ بصیرت کی صف میں علامہ اقبالؒ کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ طلوعِ اسلام اپنی اس خوش بختی پر جسقدر بھی ناز کرے کم ہے کہ اب یہی سعادت اسکے حصہ میں آئی ہے۔ کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ یہ مشیت کا خاص پروگرام تھا کہ قرآن کی یہ آواز اُس خطہ میں بلند ہو جس میں آخرالامر ایک ایسی مملکت (پاکستان) کو قائم ہونا تھا جس نے اسلامی تصورات کو اپنے معاشرہ کی اصل و بنیاد قرار دینا اور اسکے لئے تدوینِ قوانین جیسے اہم فریضہ کو اپنے ہاتھ میں لینا تھا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت تمام عالمِ اسلام میں صرف پاکستان کی فضا ایسی ہے جس میں صحیح قرآنی تصورات اس سرعت سے عام ہو رہے ہیں۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (۱۰:۵۸)]

قدامت پرست طبقہ کی طرف سے قرآنی تصورات کی جو مخالفت ہو رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی یہ مخالفت حمیتِ دینی کا نتیجہ ہے۔ لیکن اگر اس مخالفت کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ مخالفت دراصل اپنے اپنے فرقہ کو قائم و دائم رکھنے کی غرض سے کی جا رہی ہے۔ ایک فرقے کا وجود صرف اس صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ وہ اپنے متعقدات اور رسوم و شعار کو نہایت سخت، متصلب اور ناقابلِ تغیر و تبدل قرار دے اور اس پر شدت سے اصرار کرے۔ اگر کسی وقت اس باب میں اسکے شکنجے ڈھیلے پڑ جائیں تو اس کی جداگانہ ہستی مٹنی شروع ہو جاتی ہے اور آخر الامر اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ طبیعیاتی دنیا میں اسے جہد للبقاء (Struggle For Existence) کہتے ہیں۔ مختلف فرقوں کی باہمی جنگ و نزاع، اسی جہد للبقا کی مظاہر ہے۔ قرآن چونکہ تمام فرقوں کو مٹا دیتا ہے، اسلئے قرآنی آواز کے خلاف تمام فرقے متحدہ محاذ بنا کر نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) بھی قرآن کی مخالفت اس لئے کرتے تھے کہ یہ ان کی گروہ بندیوں کو مٹاتا تھا۔ بنابریں، قدامت پرست طبقہ کے مختلف فرقوں کی یہ مخالفت بالکل قابلِ فہم ہے۔

سابقہ اشاعت میں ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر ہم میں علامہ اقبالؒ موجود ہوتے تو ان کی قرآنی بصیرت، تدوینِ قوانین کے سلسلہ میں قوم کی بڑی راہ نمائی کرتی۔ یہ زمانے کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ اقبالؒ ساری عمر ایک ایسے خطۂ زمین کی آرزو کرتے رہے جس میں قرآنی تصورات کی بنیادوں پر معاشرہ کی تشکیل کی جائے (اسی کے لئے انھوں نے پاکستان کا تصور دیا تھا)۔ لیکن آج جب کہ ایسا خطہ بھی موجود ہے اور اس میں معاشرہ کی تشکیلِ جدید کا سوال بھی درپیش، اقبال یہاں خود موجود نہیں۔ لیکن یہ امر موجبِ مسرت ہے کہ اس سلسلہ میں ان کے خیالات ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ (چھوٹے چھوٹے رسائل کو چھوڑ کر) شذرات ان کی ایک ہی اہم کتاب (یعنی لیکچرز کا مجموعہ) ہے اور یہی وہ کتاب ہے جو مغرب کی دنیائے فکر میں ان کے تعارف اور شہرت کی ضامن بنی ہے۔ اس کتاب کے چھٹے باب میں انھوں نے اس اہم مسئلہ سے بحث کی ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت جامد اور ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں، یا ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔ ہم ذیل میں اس اہم باب کا آزاد ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے اقبال کے ان خطبات کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کی زبان کس قدر فلسفیانہ، دقیق اور ایجاز و اختصار کی حامل ہے۔ ایسے مضامین کے ترجمہ میں جو دشواریاں پیش آسکتی ہیں وہ ظاہر ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ہمارے ترجمہ سے بات سمجھ میں آجائے۔ اس کے لئے بعض مشکل مطالب کی وضاحت قوسین میں مندرج عبارت سے اور بعض کی حواشی (فٹ نوٹس) سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسکے باوجود یہ ضروری ہے کہ اس مقالہ کو سرسری نظر سے نہ دیکھا جائے بلکہ اس کے ایک ایک فقرہ کو بہت غور و خوض سے پڑھا جائے اور جب تک اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آجائے آگے نہ بڑھا جائے۔ اگر آپ نے اس طرح اس مقالہ کا مطالعہ کیا تو آپ کے سامنے یہ حقیقت آجائے گی کہ قوانینِ شریعت کی تجدید کے متعلق اقبال کا نقطۂ نظر کیا تھا۔ معہذا اس چیز کو مدنظر رکھئے کہ یہ خطبات آج سے تیس سال پیشتر (۱۹۲۸ء میں) مرتب کئے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر علامہ اقبال آج زندہ ہوتے تو بعض ایسے مقام جن میں کچھ ابہام یا الجھاؤ سا محسوس ہوتا ہے، زیادہ واضح ہو جاتے۔ اس لئے کہ

ایک مفکر کی زندگی میں مزید تیس سالہ مشاہدات اور تدبر و تفکر بہت سی الجھنوں کو واضح اور پیچیدگیوں کو صاف کر دیتے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہمارے نزدیک دین میں سند صرف خدا کی کتاب ہے۔ اس بارے میں اگر ہم کسی انسان کا کوئی قول پیش کرتے ہیں تو وہ صرف تائید اً ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے اس خطبہ کو بھی ہم اسی لئے پیش کر رہے ہیں کہ اس میں (جزئیات سے قطع نظر) اصولی طور پر جو بات کہی گئی ہے وہ قرآن کی تعلیم کے مطابق ہے۔

اب آپ علامہ اقبالؒ کے خطباتِ تشکیلِ جدید کے چھٹے باب کا رواں ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔ جس کا عنوان ہے

The Principle Of Movement In The Structure Of Islam

"ایک ثقافتی تحریک کی حیثیت سے، اسلام نے کائنات کے متعلق قدیم سکونی تصور کو رد کر کے اس کی جگہ حرکیاتی تصور قائم کیا ہے۔ دوسری طرف، ایک جذباتی نظامِ وحدت کی حیثیت سے وہ فرد کی قدر و منزلت کا پورا پورا اعتراف کرتا ہے اور نوعِ انسانی کی وحدت کی بنیاد خون کے رشتوں پر نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ خون کے رشتے کو انسانی وحدت کی بنیاد قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم مادی علائق کی زمین گیری سے بلند نہیں ہونا چاہتے۔ وحدتِ انسانی کے لئے (مادی علائق سے بلند ہو کر) ایک نفسیاتی بنیاد کی تلاش و جستجو اسی صورت میں ممکن ہے جب ہمیں اس کا احساس ہو جائے کہ زندگی کی اصل بنیاد (مادی نہیں بلکہ) روحانی ہے[1]۔ اس احساس و تصور سے انسانی وفاشعاری و اطاعت پذیری کے نئے مراکز سامنے آتے ہیں جنہیں زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے کسی قسم کی رسوم پرستی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہی وہ احساس و تصور ہے جس سے انسان کے لئے مادی زمین گیری سے رستگاری ممکن ہے[2]۔ شاہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کو جو ابتداءً ایک خانقاہی نظام کی حیثیت سے منصۂ شہود پر آئی تھی، وحدتِ انسانی کی بنیاد قرار دینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس میں ناکام رہا۔ عیسائیت کی یہی وہ ناکامی تھی جس سے مجبور ہو کر شاہنشاہ جولین کو پھر سے قدیم رومی اصنامیات کی طرف رجوع کرنا پڑا، اس فرق کے ساتھ کہ اس نے اسے فلسفیانہ تعبیرات کا لبادہ اوڑھا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کا ظہور ہوا ہے۔ اُس زمانے میں مہذب دنیا کی حالت کیا ہو چکی تھی، اس کا نقشہ ایک مغربی مؤرخِ تہذیب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی حالت

اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ تصورِ شہید جو چار ہزار سال میں جا کر

---

[1] اس خطبہ میں متعدد مقامات پر روحانی Spiritual کا لفظ آئیگا۔ ان مقامات میں (Spirit) کا لفظ مادہ (Matter) کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ خانقاہی روحانیت کے معنوں میں نہیں۔

[2] "مادہ سے رستگاری" سے مراد یہ نہیں کہ مادی کائنات ایک جیل خانہ ہے جس سے نجات حاصل کرنا مقصودِ زندگی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے سامنے صرف طبیعاتی زندگی کو نہ رکھے بلکہ انسانی زندگی کو رکھے جو مادی علائق سے بلند ہو کر (حیاتِ حُرّی کی شکل میں) آگے چلتی ہے۔

تعمیر ہوا تھا، منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اور نوع انسانی پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی ہے جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین وضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ قدیم قبائلی آئین اپنی قوت واحترام کھو چکے تھے۔ اس لئے اب ملوکیت کے انداز کہن کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن آئین ودساتیر کو رائج کیا تھا، وہ نظم وضبط اور وحدت ویکجہتی کے بجائے تشتت وافتراق اور ہلاکت وبربادی کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وقت وہ آچکا تھا جب ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند وبالا درخت جس کی سرسبز اور شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے زریں ثمرات سے بہرہ یاب ہو چکی تھیں۔ اب لڑکھڑا رہا تھا عقیدت واحترام کی زندگی بخش نمی اسکے تنے سے خشک ہو چکی تھی۔ اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ سلسلہ حرب وضرب کے طوفانوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے، اور یہ ٹکڑے صرف رسومات پارینہ کے بندھن سے ایک جگہ قائم تھے لیکن ان کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ نہ معلوم کب گر پڑیں۔

ظہور اسلام کے وقت دنیائے تہذیب وتمدن کا یہ نقشہ کھینچنے کے بعد یہ مؤرخ سوال اٹھاتا ہے کہ

کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر کہیں سے پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوع انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دیتا اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لیتا؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیے تھا اس لئے کہ پرانی رسومات اور آئین وضوابط سب مردہ ہو چکے تھے اور ان ہی جیسے اور آئین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔

اس کے بعد یہ مورخ لکھتا ہے کہ اُس وقت دنیا کو ایک ایسے کلچر کی ضرورت تھی جو "تخت وتاج کے کلچر" اور وحدت انسانی کے ان تمام نظامہائے کہن کی جگہ لے لیتا جن کا مدار خون کے رشتوں پر تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ امر موجب حیرت واستعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر سرزمین عرب سے پیدا ہوا اور عین اُس وقت پیدا ہوا جب دنیا کو اس کی اشد ضرورت تھی۔

لیکن اس میں حیرت واستعجاب کی کوئی بات نہیں۔ حیات کائنات وجدانی طور پر اپنے تقاضوں کا احساس کر لیتی ہے اور نازک ساعتوں میں وہ اپنا رخ آپ متعین کر لیتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے مذہب کی زبان میں وحی نبوت کہا جاتا ہے۔ یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ اسلام کا خورشید جہانتاب ایک ایسی سادہ قوم کے افق شعور سے طلوع ہوتا جسے کسی قدیم ثقافت کی ہوا تک نہ لگی تھی اور جو ایک ایسی سرزمین میں بستی تھی جہاں تین بڑے براعظم بغل گیر ہوتے تھے۔ اس جدید ثقافت

نے دنیا کو بتایا کہ وحدتِ انسانیت کی بنیاد صرف اصولِ "توحید" پر رکھی جا سکتی ہے۔ نظامِ سیاست کی حیثیت سے اسلام، اس اصولِ توحید کو، نوعِ انسانی کی جذباتی اور فکری زندگی میں ایک جیتا جاگتا عنصر بنانے کا عملی ذریعہ ہے۔ اس کا مطالبہ تخت و تاج کی اطاعت نہیں۔ صرف خدا کی اطاعت ہے۔ اور چونکہ ذاتِ خداوندی، حیاتِ کُلّی کی روحانی اساس و بنیاد ہے، اس لئے خدا کی اطاعت سے مفہوم، انسان کا خود اپنی مثالی فطرت کی اطاعت ہے۔ نہ کسی غیر کی محکومیت۔

ثبات و تغیر کا امتزاج

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کُلّی کی یہ روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دَور دَورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹِکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں — وہ تغیر جسے، قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے[1] — تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچسو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصولِ حرکت کار فرما ہے؟ یہ اصول وہی ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اجتہاد

اجتہاد کے لُغوی معنی جد و جہد اور پوری پوری کوشش کے ہیں۔ اور اسلامی قانون کی اصطلاح میں، کسی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرنے کے لئے جد و جہد کا نام اجتہاد ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تصور قرآن کریم کی اس آیۂ جلیلہ سے مستنبط ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹)۔ جو لوگ ہماری متعین کردہ منزل تک پہنچنے کے لئے پوری پوری کوشش کرتے ہیں، ہم انہیں اس منزل تک پہنچنے کے راستے دکھا دیتے ہیں۔ اس کی تشریح نبی کریمؐ کی ایک حدیث میں ملتی ہے۔ روایت ہے کہ جب حضرت معاذؓ کو یمن کا گورنر مقرر کیا گیا تو رسول اللہؐ نے اُن سے پوچھا کہ وہ معاملات کے فیصلے کس طرح کریں گے۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ میں تمام امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کروں گا۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر کسی معاملہ میں کتاب اللہ سے راہ نمائی نہ

---

[1] اِنَّ فِيْ اِخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ...... لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ (۱۰/۶)

ملے تو پھر؟ اس کے جواب میں حضرت معاذ نے کہا کہ ایسی صورت میں، میں رسول اللہؐ کے نظائر کی طرف رجوع کروں گا۔ مکرر ارشاد ہوا کہ اگر اس باب میں یہ نظائر بھی خاموش ہوں، تو؟ "تو میں اپنے اجتہاد سے فیصلہ دوں گا"۔ یہ تھا حضرت معاذ کا جواب۔

(یہ تھی اس تصور کی ابتدا۔ لیکن) تاریخ اسلام کے طالب العلم کی نگاہ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اسلامی مملکت کی توسیع کے ساتھ، ایک منظم اور باضابطہ قانونی فکر کی ضرورت لاینفک ہوگئی۔ یہی وہ ضرورت تھی جس کے ماتحت ہمارے قدیم فقہا ـــــ عرب اور غیر عرب دونوں ـــــ اس باب میں برابر محنت کرتے رہے تاآنکہ ان کی اجتماعی فکر ہماری فقہ کے مسلّمہ مذاہب کے پیکروں میں جلوہ پیرا ہوگئی۔ یہ فقہی مذاہب اجتہاد کے تین مدارج کو تسلیم کرتے ہیں:۔

اجتہاد کے تین مدارج

(۱) اجتہاد مطلق۔ یعنی قانون سازی کا اختیار کلی۔ جو ان مذاہب کے ائمہ کی ذات تک محدود ہے۔

(۲) اضافی اجتہاد۔ یعنی کسی ایک مذہب فقہ کے اندر رہتے ہوئے، اجتہاد کی ضرورت۔

(۳) خصوصی اجتہاد۔ یعنی ان مسائل میں اجتہاد جنھیں ائمہ فقہ نے غیر معین چھوڑ دیا ہو۔

میں اس خطبہ میں صرف شق اول (اجتہاد مطلق) کے متعلق گفتگو کروں گا۔

سُنّی حضرات نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے لیکن ائمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، اُن کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظام شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب وعلل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانون شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا۔ بعض مغربی مصنفین کا خیال ہے کہ اس جمود کا باعث ترکوں کا اثر ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ خیال سطحی سا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے مذاہب فقہ، ترکوں کے اثرات کی آمد سے بہت پہلے اپنی آخری شکل میں مرتب و متشکل ہو چکے تھے۔ میرے خیال میں اس کے حقیقی اسباب حسب ذیل ہیں۔

جمود کے اسباب

(۱) اس حقیقت سے سب واقف ہیں کہ عباسیوں کے ابتدائی دور میں، اسلام میں معقولیین (معتزلہ) کی ایک تحریک پیدا ہوئی تھی جس کی وجہ سے کئی تند و تلخ بحثیں چھڑ گئی تھیں۔ مثلاً ان دو گروہوں (منقولیین اور معقولیین) کے درمیان ایک مابہ النزاع مسئلہ یہ بھی تھا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ معقولیین (معتزلہ) نے اس کے غیر مخلوق ہونے سے اس بنا پر انکار کیا کہ ان کے نزدیک یہ عیسائیت کے اس عقیدہ کی ایک دوسری شکل تھی جس کی رو سے وہ 'کلمہ' کو قدیم مانتے ہیں۔ اس کے برعکس، قدامت پرست گروہ (محدثین) نے، جنھیں بعد میں عباسی خلفاء کی تائید اس بنا

محدثین کا گروہ

پر حاصل ہو گئی کہ وہ معتزلہ کے سیاسی اثرات سے خائف تھے' معتزلہ کی اس وجہ سے مخالفت کی کہ ان کا خیال تھا کہ قرآن کو مخلوق مان کر وہ اسلامی معاشرہ کی بنیادیں کمزور کر رہے ہیں۔ مثلاً نظّام (معتزلی) کو لیجئے۔ اس نے احادیث کا قریب قریب انکار کر دیا اور حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق علانیہ کہدیا کہ وہ قابلِ اعتماد راوی نہ تھے۔ چنانچہ کچھ تو اس لئے کہ ان معتولین کے حقیقی منشاء کے متعلق لوگوں کو غلط فہمی ہوئی - اور کچھ اس لئے کہ ان میں سے بعض کے انکار بے باک سے ہو گئے' قدامت پسند گروہ نے اس تحریک کو اُمت میں انتشار پیدا کرنے کا موجب سمجھا اور اسلام کے نظامِ تمدن وسیاست کے استحکام کے لئے خطرہ تصور کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسلامی معاشرہ کو انتشار سے بچایا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کے سامنے ایک ہی طریق کار تھا۔ اور وہ یہ کہ اس کے لئے شریعت کے ڈنڈے کو استعمال کیا جائے۔ اور اپنے ضابطۂ قانون کو شدت کے ساتھ سخت گیر بنا دیا جائے۔ (یعنی اس میں نہ کوئی لچک رکھی جائے نہ کسی تغیر وتبدل کی گنجائش)۔

تصوف

(۲) اسلامی قانونِ شریعت کے جامد اور متصلب بن جانے کا یہ پہلا سبب تھا۔ اس کا دوسرا سبب' مسلمانوں میں خانقاہیت کے تصوف کی نمود اور فروغ تھا۔ اس نے بحیثیت غیر اسلامی اثرات کے ماتحت' آہستہ آہستہ' ملت کو زندگی کے عملی مسائل سے بے گانہ بنا کر قیاسی اور نظری تصورات میں الجھا دیا۔ خالص مذہبی نقطۂ نگاہ سے' تصوف نے فقہا اور متکلمین کی لفظی موشگافیوں اور نکات آفرینیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ مثال کے طور پر حضرت سفیان ثوریؒ کو لیجئے۔ یہ اپنے دور کے بڑے غائر بیں متقنین میں سے تھے' بلکہ یوں سمجھئے کہ ایک خاص فقہی مذہب کے بانی۔ لیکن چونکہ ان کا رجحان شدت سے روحانیت[1] کی طرف تھا اس لئے انھوں نے فقہا کی خشک بحثوں سے تنگ آ کر تصوف کی آغوش میں پناہ لے لی جہاں تک تصوف کے تصوراتی پہلو کا تعلق ہے۔ (جس نے بعد میں ایک فلسفہ کی شکل اختیار کر لی) یہ آزاد خیالی کا مظہر اور معتولین کا ہمرنگ ہے۔ لیکن اس نے ظاہر اور باطن کے امتیاز پر جس قدر زور دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باطن کی اہمیت بڑھتی گئی اور زندگی کے ظاہری پہلو سے بے اعتنائی اور بے التفاتی کا رجحان راسخ ہو گیا۔ ترکِ دنیا کے اس مسلک نے آگے چل کر مسلمانوں کی نگاہوں سے اسلام کے سیاسی اور تمدنی گوشے کو' جو اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے' بکسر اوجھل کر دیا۔ دوسری طرف' اس نے عقائد وافکار کی دنیا میں جس قدر آزادی دے رکھی تھی' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ملت کے بہترین دماغوں کو اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ اس طرح کان نمک میں جا کر نمک بن گئے۔ جب بہترین دماغ اس طرف چلے گئے تو سیاست لامحالہ کم پایہ اور ادنیٰ صلاحیتیں رکھنے والے افراد کے ہاتھوں میں آ گئی۔ باقی رہے عوام۔ سو چونکہ قوم میں بلند پایہ مفکرین کا فقدان ہو گیا جو ان کی صحیح فکری راہ نمائی کر سکتے۔ اس لئے انھوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ مختلف فقہی مذاہب کی اندھی تقلید کرتے رہیں۔

---

[1] اس سے مراد تصوف کی روحانیت ہے۔

زوالِ بغداد

(۳) ان سب پر طرہ یہ کہ تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں بغداد پر تباہی آگئی جو مسلمانوں کی حیاتِ عقلی کا مرکز بن چکا تھا۔ یہ حادثہ فی الحقیقت مسلمانوں کے لئے طامۃ الکبریٰ اور ایسا جانکاہ صدمہ تھا کہ اُس زمانے کے کم و بیش تمام ہمعصر مؤرخین جب تاتاری حملوں کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہیں تو دبی زبان سے خود اسلام کے مستقبل کے متعلق مایوسی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جب اس تباہی نے ملت کا شیرازہ اس طرح بکھیر دیا، تو قدامت پرست مفکرین نے، قوم کو مزید انتشار سے بچانے کی خاطر اپنی تمام تر توجہات کو اس ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا کہ کسی نہ کسی طرح معاشرتی زندگی کی یکسانیت کو محفوظ رکھ لیا جائے۔ اس کے لئے انھوں نے فتویٰ دے دیا کہ فقہائے سلف نے جو قوانینِ شریعت مرتب کر دیئے ہیں، ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جا سکتا۔ (اس طرح ہر قسم کی ندرت فکر، بدعت یعنی ضلالت قرار پا گئی) ان حضرات کے پیشِ نظر صرف ملت کا معاشرتی نظم تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس باب میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے۔ اس لئے کہ جماعتی نظم زوال آور عناصر کی کچھ نہ کچھ روک تھام تو کر ہی دیتا ہے۔ لیکن انھوں نے اس اہم حقیقت کو نہ سمجھا۔ اور نہ ہی اسے ہمارے دَور کے علماء سمجھتے ہیں۔ کہ کسی قوم کے مستقبل کا انحصار ان کے جماعتی نظم پر اتنا نہیں ہوتا جتنا افراد کی قوت اور صلاحیت پر ہوتا ہے۔ ایک ایسے معاشرہ میں جس میں جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے، فرد کی انفرادیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے معاشرتی فکر کے سرمایہ کا تو مالک بن جاتا ہے۔ لیکن اس کی اپنی روح مردہ ہو جاتی ہے۔

ماضی کا جھوٹا احترام

لہٰذا قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اسکے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے کہا ہے۔

> تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنھوں نے انھیں فرسودہ بنا دیا ہو۔

لہٰذا زوال آور عناصر کی روک تھام کا موثر طریقہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قوم میں بخود خزیدہ افراد کو پیدا کیا جائے۔ یہی وہ افراد ہیں جو زندگی کی گہرائیوں کے سربستہ راز کھولتے ہیں۔ وہ ایسے نئے معیارِ زیست سامنے لاتے ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارا ماحول ایسا غیر متبدل نہیں کہ اسے چھوا تک نہ جائے۔ ہم اس میں تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔ قدامت پرست علماء کا یہی وہ رجحان تھا جس کا ردِ عمل امام ابن تیمیہ کی صورت میں نمودار ہوا۔

امام ابن تیمیہؒ

ابن تیمیہؒ بغداد کی تباہی کے پانچ سال بعد ۱۲۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت حنبلی مذہب

کی روایات کے زیرِ سایہ ہوئی تھی۔ وہ ایک زبردست اہلِ قلم اور نہایت سرگرم مبلغِ اسلام تھے۔ انھوں نے خود مجتہد ہونے کا دعوے کیا اور اس عقیدہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اور جو کچھ مذاہبِ فقہ نے مرتب کر دیا ہے وہ شریعت میں حرفِ آخر ہے۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح ابتداءً فقہ مرتب ہوئی تھی، ہم بھی انہی اصولوں کے ماتحت اسے از سرِ نو مرتب کر سکتے ہیں۔ فرقۂ ظاہریہ کے امام ابن حزمؒ کی طرح، انھوں نے بھی حنفی مذہب کے قیاس اور اجماع کے اُس تصور کی تردید کی جو ان کے ہاں شروع سے چلا آ رہا تھا۔ اس لئے کہ ان کی رائے یہ تھی کہ اس طرح کا اجماع درحقیقت توہم پرستیوں کی بنیاد ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام ابن تیمیہؒ کے زمانے میں جس قسم کی ذہنی ابتری اور اخلاقی کمزوری عام ہو رہی تھی، اُس کے پیشِ نظر اُن کا یہ مسلک بالکل درست تھا۔

سولھویں صدی میں امام سیوطیؒ نے بھی مجتہد ہونے کا دعوےٰ کیا اور اس کے ساتھ ہی اس عقیدہ کا بھی اضافہ کیا کہ ہر صدی کے آخر پر ایک مجدد پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ابن تیمیہؒ کی تعلیم کی روح کا مکمل مظاہرہ اس تحریک میں جا کر ہوا جو اٹھارویں صدی میں ریگزارِ نجد سے اٹھی۔ اُس خطہ سے جسے میکڈانلڈ نے "زوال پذیر اسلامی دنیا کا پاکیزہ ترین خطہ" قرار دیا ہے۔

نجدی تحریک

یہ تحریک عظیم مضمرات و ممکنات کی حامل تھی۔ اس سے اسلام کی حیاتِ تازہ کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلامی ایشیا اور افریقہ کی قریب قریب تمام جدید تحریکوں کا سرچشمۂ زندگی، بالواسطہ یا بلا واسطہ یہی تحریک نجد ہے۔ مثلاً سینوسی کی تحریک۔ بین الاسلامی (پان اسلامک) تحریک۔ یا ایران کی بابی تحریک، جو درحقیقت عربی پراٹسٹنٹ تحریک کا ایرانی عکس ہے۔ ان سب میں وہی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ اس نجدی تحریک کا بانی، محمد بن عبدالوہابؒ ۱۷۰۰ء میں پیدا ہوا۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدینہ میں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے ایران کا سفر کیا۔ اور پھر اپنی مسلسل سعی و عمل سے انھوں نے اپنی روحِ بے قرار کی حرارت کو تمام عالمِ اسلامی کے رگ و پے میں دوڑا دیا۔ ان کا جوشِ عمل، امام غزالی کے شاگرد، ابنِ تومارت کے جوش و ولولے کے مشابہ تھا جو اندلس کی تباہی کے بعد پیدا ہوا اور جس نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس وقت ہم اس (نجدی) تحریک کی سیاسی سرگرمیوں سے بحث نہیں کرنا چاہتے جنھیں محمد علی پاشا نے ختم کر دیا۔ اس تحریک کے اس اجمالی سے تذکرہ سے مقصود صرف اُس روحِ آزادی کو سامنے لانا تھا جس کی یہ مظہر تھی، اگرچہ اپنی داخلی سرشت میں یہ تحریک بھی قدامت پرستی ہی پر مبنی تھی۔ یعنی یہ تحریک ایک طرف اِس عقیدہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتی تھی کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ اور اپنے لئے حقِ اجتہاد کی زبردست مدعی ہے۔ لیکن دوسری طرف، ماضی کے متعلق اس کا طرزِ عمل یکسر غیر ناقدانہ تھا اور قوانینِ شریعت کے لئے وہ صرف احادیثِ نبوی پر دار و مدار رکھتی تھی[1]

---

[1] یہی تحریک ہے جو عوام میں وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی اور جو اب مسلک اہلِ حدیث کی شکل میں متعارف ہے۔ یہ حضرات اہلِ فقہ پر تو اعتراض کرتے ہیں کہ وہ ماضی پرست ہیں اور خود اپنی حالت یہ ہے کہ روایات سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹنا چاہتے۔ نہ ہی ان پر کسی قسم کی تنقید روا رکھتے ہیں۔ اس لئے یہ اہلِ فقہ سے بھی زیادہ ماضی پرست ہیں۔

ترکی

اب ترکی کی طرف آیئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اجتہاد کا نظریہ جسے عصرِ حاضر کے فلسفیانہ تصورات نے بڑی تقویت اور وسعت دیدی ہے، ترکوں کی مذہبی اور سیاسی فکر میں ایک عرصے سے کارفرما ہے۔ یہ حقیقت قانونِ شریعت کے متعلق علیم ثابت کے جدید نظریہ سے بالکل ظاہر ہے جس کی بنیاد جدید عمرانی تصورات پر رکھی گئی ہے۔ اگر اسلام کی نشأۃ ثانیہ ایک حقیقت ہے اور میرا ایمان ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے تو ترکوں کی طرح ایک دن ہمیں بھی اپنی علمی میراث کا ازسرِنو جائزہ لے کر اس کی صحیح صحیح قیمت متعین کرنی ہوگی۔ اس سے اگر ہم نے عام فکرِ اسلامی میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہ بھی کیا، تو ہم کم از کم اتنا تو کر سکیں گے کہ اپنے ماضی پر صحیح تنقید سے بے راہ روی اور مذہب سے برگشتگی کی اُس رَو کو تھام سکیں جو اس وقت عالمِ اسلام میں بڑھتی چلی جارہی ہے۔

میں اب ترکی کے مذہبی اور سیاسی افکار و رجحانات کا ایک اجمالی سا خاکہ آپکے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اس ملک کے فکر و عمل کے دوائر میں اجتہاد کی قوت کس درجہ نمایاں ہو رہی ہے۔ اب سے کچھ وقت پہلے، ترکی میں دو مکاتبِ فکر تھے۔ ایک وہ جس کی نمائندگی وہاں کی نیشنلسٹ پارٹی کرتی تھی اور دوسرا وہ جس کی ترجمان مذہبی اصلاح کی علمبردار جماعت تھی۔ نیشنلسٹ پارٹی کے پیش نظر سب سے اہم سوال مذہب نہیں بلکہ مملکت کا مفاد ہے۔ ان کے نزدیک مذہب کا کوئی آزادانہ منصب ہی نہیں۔ قومی زندگی میں مملکت ہی وہ ضروری عنصر ہے جس سے دیگر عناصر کے فرائض و مناصب متعین ہوتے ہیں۔ انھوں نے چنانچہ، مذہب اور سیاست کے فرائض کے متعلق قدیم خیالات کو یکسر مسترد کر دیا ہے اور اس امر پر مُصر رہے ہیں کہ مذہب کو ریاست سے الگ کر دینا چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک مذہبی اور سیاسی نظام کی حیثیت سے اسلام کی ہیئتِ ترکیبی اس قسم کے تصور کی اجازت دیتی ہے[1] اگرچہ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ سمجھنا غلط ہے کہ مملکت کے تصور کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ یہ تمام دیگر اسلامی تصورات پر غالب اور حاکم ہے (حقیقت یہ ہے کہ) اسلام میں روح اور مادہ (دین اور دنیا) دو الگ الگ دوائرِ حیات

دین اور سیاست کی ثنویت

نہیں اور اس کا فیصلہ کہ فلاں کام دنیاوی ہے یا دینی، اس کام کے کرنیوالے کی نیت سے ہوتا ہے، خواہ اس کام کا مقصود کیسا ہی دنیاوی کیوں نہ ہو۔ (بالفاظِ دیگر) کسی کام کے دنیاوی یا دینی ہونے کا فیصلہ اُس کام کی نوعیت نہیں کرتی بلکہ وہ ذہنی پس منظر کرتا ہے جو بالکل غیر مرئی (Invisible) ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کام "دنیاوی" اُس وقت کہلائے گا جب اسے زندگی کے گوناگوں علائق سے یکسر بے تعلق ہو کر کیا جائے۔ لیکن وہی کام "روحانی" ہو جائے گا اگر اس کا جذبۂ محرکہ حیات کے وہ علائق ہوں۔ اسلام میں ایک ہی حقیقت کو اگر ایک زاویۂ نگاہ

---

[1] ہم اس فقرے کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔ اس لئے کہ اسکے بعد حضرت علامہ نے شرح و بسط سے واضح کیا ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست کی ثنویت کی قطعاً گنجائش نہیں۔

سے دیکھا جائے تو وہ مذہب (کلیسا) بن کر دکھائی دیتی ہے اور اُسے دوسرے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ مملکت ہو جاتی ہے (یعنی اسلام میں مذہب اور سیاست ایک ہی حقیقت ہے) حتیٰ کہ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ مذہب اور مملکت ایک سکے کے دو رخ یا دو گوشے ہیں۔ (دو رخ یا دو گوشے نہیں۔ بلکہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں)۔ اسلام ایک ناقابلِ تقسیم اور واحد حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو جس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے یہ وہی بن جائے گی۔ یہ نقطہ بڑا دور رس ہے اور اگر اس کی وضاحت شرح وبسط سے کی جائے تو ہم نہایت بلند اور دقیق فلسفیانہ بحث میں الجھ جائیں گے۔ اس لئے میں اس مقام پر صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ مذہب اور سیاست کی ثنویت، اس قدیم غلط تصور کی پیدا کردہ ہے جس کی رُو سے انسان کی وحدت کو ان دو جداگانہ حقیقتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جن کے متعلق یہ سمجھا گیا کہ ان کا ایک نقطۂ اتصال تو ضرور ہے لیکن یہ درحقیقت ایک دوسرے سے یکسر متغائر اور متضاد ہیں۔ (یعنی روح اور مادہ کی مغائرت کا تصور) لیکن

روح اور مادہ

حقیقت یہ ہے کہ جب روح (Spirit) کو زمان ومکان کی نسبتوں سے دیکھا جائے تو اُسے مادہ کہتے ہیں۔ (اس لئے روح اور مادہ الگ الگ حقیقتیں نہیں ہیں)۔ وہ وحدت جسے انسان کہا جاتا ہے جسم دکھائی دے گی جب ہم اُسے خارجی دنیا میں کام کرتا دیکھیں۔ لیکن جب ہم اُس مقصد اور غایت پر نگاہ رکھیں جس کے لئے وہ کام کیا جا رہا ہے تو یہی وحدت روح (Soul) یا (Mind) بن جائے گی۔ "توحید" کو جب ایک عملی تصور کی حیثیت سے دیکھا جائے تو مساوات۔ سالمیت (Solidarity) اور حریت اس کے بنیادی خصائص نظر آئیں گے۔ جس ادارہ کو مملکت کہا جاتا ہے، اسلامی نقطۂ نگاہ سے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ "توحید" کے انہی بنیادی خصائص کو مادی پیکروں میں متشکل اور کارفرما کرنے کا ذریعہ ہے۔ یا بالفاظ دیگر، اس نصب العین کو انسانی معاشرہ کے قالب میں ڈھالنے کی آرزو۔ اسلام میں مملکت کے "خدائی حکومت" (تھیاکریسی) ہونے سے مفہوم صرف اتنا ہی ہے۔ اس سے یہ مفہوم نہیں کہ اس

تھیاکریسی

کا رئیس یا صدر، خدا کا نائب ہے جو اپنے مستبدانہ ارادوں اور جابرانہ فیصلوں کو مرعومہ معصومیت کے نقاب میں چھپا کر خدا کے بندوں پر اپنا حکم چلاتا ہے۔ جو لوگ اسلامی نظامِ حکومت پر تنقید کرتے ہیں ان کی نگاہوں سے یہ اہم حقیقت اوجھل ہوتی ہے۔ عصرِ حاضر کی سائنس نے اس حقیقت کو منکشف کر دیا ہے کہ مادہ اپنا الگ وجود نہیں رکھتا۔ اس کی اصل روح (Spirit) کے اندر ہے۔ اس انکشاف نے اسلام، بلکہ دنیائے مذاہب کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ مادی دنیا یا محسوس کائنات کوئی نجس اور قابلِ نفرت شے نہیں ہے مادہ کا یہ عظیم ذخیرہ محض اس لئے وجود میں لایا گیا ہے کہ اسکے ذریعہ انسانی ذات (Spirit) اپنے اندر استحکام پیدا کر کے اپنے مقام کو پالے۔ لہٰذا مادی کائنات مقدس اور پاکیزہ ہے۔ نجس اور خبیث نہیں۔ رسول اللہؐ کے حسین الفاظ میں "یہ تمام دنیا مسجد ہے"۔ لہٰذا اسلامی نقطۂ نگاہ سے، مملکت اُس کارگاہ کا نام ہے جس کے اندر انسانی ذات، معاشرہ کی وساطت سے، بیدار اور مستحکم ہو کر اپنے مقام کو پالیتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر وہ مملکت جو تغلب وتسلط پر مبنی

نہ ہو، اور جس کا مقصد ان مثالی اصولوں کا حصول ہو "حکومتِ خداوندی" تھیاکریٹک اسٹیٹ) ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترک قومیت پرستوں کے ذہن میں مذہب اور ریاست کی تفریق کا خیال، یورپ کے سیاسی

چرچ اینڈ اسٹیٹ

افکار کی تاریخ کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔ قدیم عیسائیت ایک سیاسی یا معاشرتی نظام کی صورت میں وجود میں نہیں آئی تھی۔ وہ ایک "نجس اور خبیث دنیا" میں نظامِ خانقاہیت کی حیثیت سے وارد ہوئی تھی جس کا انسان کے عمرانی معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان معاملات میں وہ رومی اقتدار کے تابع تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مملکت نے مذہب عیسائیت اختیار کیا تو اسٹیٹ اور چرچ (کلیسا) ایک دوسرے کے حریف بن کر سامنے آئے اور ان میں یہ لامتناہی نزاع پیدا ہو گئی کہ ایک کا دائرۂ اثر و نفوذ کیا ہے اور دوسرے کے حدودِ اقتدار کون سے؟ اسلام میں ایسی صورتِ حالات کبھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے کہ اسلام شروع ہی سے ایک معاشرتی نظام کی حیثیت سے منصۂ شہود پر آیا تھا جسے قرآن نے ایسے سیدھے سادے قانونی اصولوں کا ضابطہ عطا کر دیا تھا جس

قرآن کے قانونی اصول

میں رومیوں کے مشہور بارہ جدولوں کی طرح، اس امر کی صلاحیت تھی کہ وہ (ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق) نئی نئی تعبیرات کی رو سے پھیلتا چلا جائے۔ چنانچہ بعد کے تجربے نے ثابت کر دیا کہ قرآن نے جو قانونی اصول دیئے ہیں ان میں فی الحقیقت ان وسعتوں کے امکانات موجود ہیں۔ لہٰذا ترکوں کی نیشنلسٹ پارٹی نے مملکت کے متعلق جو نظریہ قائم کیا ہے وہ یکسر گمراہ کن ہے۔ اس لئے کہ وہ مذہب اور سیاست میں اُس ثنویت کے تصور پر مبنی ہے جس کا اسلام میں کوئی وجود نہیں۔

اس کے برعکس، مذہبی اصلاحات کی پارٹی جس کے سرکردہ، سعید حلیم پاشا تھے۔ اس اصل الاصول پر مُصر تھی کہ اسلام، تصوریت (Idealism) اور ایجابیت Positivism (روح اور مادہ) کا حسین مرکب ہے۔ یعنی اس میں بلند آفاقی اصولِ حیات، مادی پیکروں میں عملاً متشکل ہو جاتے ہیں۔ یہ حریت، مساوات اور سالمیت کی مستقل اقدار اور ابدی صداقتوں کا مجموعہ ہے جسے وطنیت کی چار دیواری میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ سعید حلیم پاشا کے الفاظ میں "جس طرح برطانوی

وطنیت

ریاضیات، جرمن فلکیات اور فرانسیسی کمسٹری (کیمیا) کا تصور غلط ہے۔ اسی طرح ترکی، عربی، ایرانی یا ہندی اسلام کا تصور بھی باطل ہے۔ (یعنی جو حقائق عالمگیر ہوں، وہ وطنی اضافتوں سے ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جا سکتے)۔ جس طرح سائنس کے حقائق کی عالمگیریت، مختلف قوموں میں مختلف سائنٹفک کلچر پیدا کر دیتی ہے اور ان تمام کلچرز کا مجموعہ انسانی علم کہلاتا ہے۔ اسی طرح اسلام کی عالمگیر اقدار، مختلف قوموں میں مختلف ملی۔ اخلاقی اور معاشرتی نصب العین پیدا کر دیتی ہیں (اُن اقدار کو نہیں بدل دیتیں)۔ سعید حلیم پاشا نے یہ بھی کہا ہے کہ موجودہ کلچر جس کی بنیاد قومی انانیت پر ہے،

قومیت پرستی

دہشت و بربریت ہی کی دوسری شکل ہے۔ یہ حد سے بڑھے ہوئے نظامِ کارخانہ داری HIDUSTPialism کی پیداوار ہے جس کے ذریعے انسان اپنے جبلی (اور حیوانی) تقاضوں

اور رجحانات کی تسکین کر لیتا ہے۔ وہ (سعید حلیم پاشا) متاسف ہیں کہ ہماری تاریخ میں، اسلام کے اخلاقی اور معاشرتی اصول، مقامی اثرات اور (جو قومیں مسلمان ہوئیں ان کے) زمانۂ قبل از اسلام کے توہم پرستانہ عقاید و مسالک کی وجہ سے، آہستہ آہستہ غیر اسلامی ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ اسلام کے یہ اصول، اسلامی کم اور ایرانی، ترکی اور عربی زیادہ ہیں۔ اسلام کے عالمگیر اور غیر شخصی اخلاقی اصولوں پر مقامی اثرات کا کچھ ایسا رنگ چڑھ گیا ہے کہ اس کی اصلی شکل و صورت، اب پہچانی ہی نہیں جاتی۔ حتٰی کہ اصولِ توحید کی مقدس جبین پر اصنام پرستی تک کے دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ اندریں حالات، ہمارے

کشادکار کی راہ

لئے کشادکار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے۔ انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے۔ اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

غرض، یہ ہیں ترکی کے جلیل القدر وزیر، سعید حلیم پاشا کے خیالات۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ایک ایسے راستے پر چلتے ہوئے جو روحِ اسلامی سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے، یہ مفکر قریب قریب اُسی نتیجہ پر پہنچا ہے جو وہاں کی نیشنلسٹ پارٹی کا موقف ہے۔ یعنی اجتہاد کی آزادی تاکہ جدید فکر اور زمانہ کے تجربات کی روشنی میں قانونِ شریعت کو از سرِ نو مرتب کیا جائے

(اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے بتایا ہے کہ (مثلاً) الغائے خلافت کے مسئلہ میں ترکوں نے کس طرح اُن خطوط پر اجتہاد سے کام لیا ہے جن کی طرح ابن خلدون اور قاضی ابوبکر باقلانی جیسے مفکر بہت پہلے ڈال چکے تھے۔ پھر انھوں نے ترکی کے مشہور انقلابی شاعر ضیا کی بعض نظموں کے اقتباسات سے اس نقطہ کی وضاحت کی ہے کہ ترکی فکر کس طرح اپنے لئے نئی نئی راہیں تراش رہی ہے۔ اس شاعر نے اپنے جوشِ تجدد پسندی میں یہ بھی کہا ہے کہ اسلامی قانونِ وراثت کی رُو سے عورت کو جو مرد سے نصف حصہ ملتا ہے، یہ اصولِ مساوات کے خلاف ہے۔ علامہ اقبال نے اُس کے اس خیال کی تردید آگے چل کر کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس کا یہ اعتراض قرآن کے قوانینِ وراثت سے بے خبری کی بنا پر ہے۔

ان تصریحات کے بعد، علامہ اقبال لکھتے ہیں)

حقیقت یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں ترکی ہی وہ قوم ہے جس نے ملائیت کے خوابِ گراں سے بیدار ہو کر شعورِ ذات حاصل کیا ہے۔ یہی وہ قوم ہے جو بجا طور پر فکری آزادی کا دعوےٰ کر سکتی ہے۔ یہی ہے جو تصورات کی دنیا سے آگے بڑھ کر حقائق کی دنیا کی طرف آ رہی ہے[1] اس عبوری دور سے گذرنے کے لئے ایک شدید ذہنی اور اخلاقی کشمکش ناگزیر تھی۔ اب، وسعت طلب

---

[1] واضح رہے کہ اس جوشِ تجدد پسندی میں جہاں جہاں ترکوں کا دامن قرآن سے چھوٹا ہے نہ علامہ اقبال اس کی تائید کرتے ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

اور حرکت پسند زندگی کی پیچیدگیاں اس کے سامنے نئے نئے مواقع پیش کریں گی۔ جن کے لئے نئے زاویوں سے سوچنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے اسلام کے غیر متبدل) اصولوں کی جدید تعبیرات ہونگی ـــــ یعنی اُن اصولوں کی جدید تعبیرات جو ان لوگوں کے لئے جو روحانی کشادگی کی سرتوں سے ناآشنا ہوں محض نظری حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ قول برطانوی مفکر ہابز کا ہے کہ اگر مسلسل اور متواتر ایک ہی قسم کے خیالات اور احساسات پیدا ہوں، تو سمجھیے کہ خیالات اور احساسات سرے سے پیدا ہی نہیں ہو رہے۔ (یعنی اگر ندرتِ فکر و احساس نہ رہے تو انسانی قلب و دماغ مردہ ہوتے ہیں)

مسلم اقوام کی حالت

آج مسلم اقوام کی اکثریت کی حالت ایسی ہی ہو چکی ہے۔ وہ لکیر کے فقیر ہیں جو محض ایک مشین کی طرح پرانی اقدار کی رٹ لگاتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس، ترک اس راستہ پر گامزن ہو گئے ہیں جس میں نئی نئی قدروں کی تخلیق ہوگی۔ یہ قوم ایسے تلخ تجارب سے گذری ہے کہ اب اس کی عمیق خودی اس پر منکشف ہو رہی ہے۔ اس کی ذات میں روحِ حیات مضطرب و بیقرار نظر آ رہی ہے۔ نئی اُمنگیں پیدا ہو رہی ہیں۔ نئی نئی مشکلات سامنے آ رہی ہیں جن کے حل کے لئے نئی نئی تعبیرات سُجھائی دے رہی ہیں۔ وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اُس کے ـــــ اور جو زود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے ـــــ سامنے آنے والا ہے۔ یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جد و جہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ

روحِ عمریؓ

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

ہم دنیائے اسلام میں اس قسم کی تحریکِ آزادی کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ آزاد خیالی کا یہ رجحان، اسلام کی تاریخ میں بڑا نازک لمحہ ہے۔ آزادیٔ افکار، ملت میں تشتت و انتشار پیدا کرنے کا موجب بھی بن سکتی ہے۔ (اس کے ساتھ ہی) عالمِ اسلام میں نسلی امتیاز کا جو تخیل آجکل اس زور شور سے ابھر رہا ہے، اس سے یہ خدشہ ہے کہ کہیں عالمگیر انسانیت کا وہ گراں مایہ تصور جسے

آزاد خیالی کا خطرہ

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ) نہ طلوعِ اسلام۔ جیسا کہ ہم شروع میں کہہ چکے ہیں یہ امر موجبِ بدقسمتی تھا کہ اس ذہنی انقلاب کے وقت ترکوں میں کوئی ایسا صاحبِ بصیرت نہ تھا جو قرآن کی روشنی میں ان کی راہ نمائی کر کے انہیں اعتدال کے راستے پر لے چلتا۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اپنی بعد کی تحریروں میں اس پر تنقید بھی کی ہے اور اظہارِ تاسف بھی۔

مسلمانوں نے اپنے دین سے حاصل کیا تھا، اُن کے اُفقِ ذہنی سے ناپید ہی نہ ہو جائے۔ نیز یہ خطرہ بھی ہے کہ اگر ان کی مناسب روک تھام نہ کی گئی تو ہمارے مذہبی اور سیاسی مصلحین، وسیع الخیالی کے جوش میں اصلاح کی حدود سے تجاوز نہ کر جائیں[1]۔ ہم آجکل اسی قسم کے دور سے گذر رہے ہیں جس سے یورپ پراٹسٹنٹ تحریک کے زمانے میں گذرا تھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لوتھر کی تحریک کے آغاز و نتائج سے جو سبق ہمیں سیکھنا چاہیئے وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ تاریخ کے عمیق مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پراٹسٹنٹ تحریک، دراصل ایک سیاسی تحریک تھی جس کا یورپ پر یہ اثر ہوا

وطنیت کا بُت

کہ رفتہ رفتہ عیسائیت کے عالمگیر اخلاق کی جگہ، قومی نظامِ اخلاق نے لے لی۔ اس رجحان کے اثرات، ہم نے گذشتہ جنگِ عظیم (پہلی عالمگیر جنگ) میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں۔ اس جنگ نے بجائے اس کے کہ یہ دو متضاد نظامہائے اخلاق میں ہم آہنگی پیدا کرتی، یورپ کے حالات کو اور بھی ناقابلِ برداشت بنا دیا، لہٰذا دنیائے اسلام کے راہنماؤں کا فریضہ ہے کہ یورپ میں جو کچھ ہوا ہے وہ اس کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور اسلام اپنے معاشرتی اور سیاسی نظام کی رُو سے جس نصب العین کی طرف لے جاتا ہے، اُسے نگاہوں کے سامنے رکھتے ہوئے، اصلاحِ حالات کے لئے قدم اٹھائیں۔

میں نے اجتہاد کی تاریخ اور جس طریق سے وہ آجکل عالمِ اسلام میں عمل پیرا ہو رہا ہے، اس کا ایک اجمالی سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب میں یہ بتاؤں گا کہ اسلامی قوانینِ شریعت کی تاریخ اور ہیئت ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے کہ

جدید تعبیرات کا امکان

اسلام کے اصولوں کی جدید تعبیر ممکن ہے یا اس نتیجہ پر کہ ان میں جدید تعبیرات کا امکان نہیں؟ بالفاظ دیگر، سوال یہ ہے کہ آیا ہمارے قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی صلاحیت ہے یا نہیں؟ یہی سوال، بان یونیورسٹی کے السنۂ سامیہ کے پروفیسر ہارٹن نے، اسلامی فلسفہ اور الٰہیات کے ضمن میں اٹھایا ہے۔ چنانچہ، یہ پروفیسر، مسلم مفکرین کی ان کوششوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جو انھوں نے خالص مذہبی فکر کے سلسلہ میں کی ہیں، لکھتا ہے کہ تاریخِ اسلام، آرین علم و ثقافت اور سامی مذہب کی متغائر قوتوں میں تدریجی تعامل۔ ہم آہنگی اور عُمق پیدا کرنے سے عبارت ہے۔ مسلمان ہمیشہ اپنے مذہبی نقطۂ نگاہ کو ان ثقافتی عناصر سے تطبیق دیتے رہے ہیں جو ان کے گرد و پیش کی اقوام سے ان کی طرف آتے رہے۔ چنانچہ ۸۰۰ء سے لے کر ۱۱۰۰ء تک مسلمانوں میں کم از کم ایک سو فقہی مکاتب پیدا ہوئے۔ یہ اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ اسلامی فکر میں کس قدر لچک ہے اور قدیم مفکرین نے اس باب میں کس قدر انتھک کوششیں کی ہیں۔ اس طرح اسلامی فکر اور مسلمانوں کے لٹریچر کے گہرے مطالعہ کے بعد، یہ مغربی مستشرق اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ

---

[1] اصلاح کی صحیح حدود یہ ہیں کہ قرآن کریم کی پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے اصلاح کی جائے۔ نہ کہ (Secular) بن کر۔

اسلام کی روح (اسپرٹ) وسیع ہی نہیں بلکہ قریب قریب لامحدود ہے۔ اس نے دہریت
کو چھوڑ کر اپنے گردوپیش کی اقوام کے باقی تمام تصورات کو نہ صرف اپنایا بلکہ انھیں اپنی
مخصوص راہ نمائی میں شاہراہِ ترقی پر بھی ڈال دیا ہے۔

اسلام کی یہ "خذ ما صفا" کی اسپرٹ قانون کے دائرہ میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ چنانچہ مشہور ولندیزی ناقدِ اسلام پروفیسر ہرگرونج، اس باب میں لکھتا ہے۔

جب ہم اسلامی فقہ کی نشوو ارتقاء کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر ہمیں حیرت
ہوتی ہے کہ ایک طرف ہر دور کے علماء چھوٹی چھوٹی جزئیات کے اختلاف سے مشتعل
ہو کر ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگاتے ہیں، اور دوسری طرف وہی علماء اپنے
متقدمین کے اُنہی اختلافات میں موافقت اور مطابقت پیدا کرنے کے لئے باہمدگر متحدو
ہم مقصد ہو کر کوشاں رہتے ہیں۔

روحِ اسلام کی عالمگیریت

عصرِ حاضر کے ان مغربی ناقدین کے ان خیالات کی رُو سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے وقت، روحِ اسلام کی اندرونی عالمگیریت، علماء کی شدید قدامت پرستی کے علی الرغم، کارفرما ہو کر رہے گی۔ اور مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ اگر دورِ حاضر کے ناقدین، فقہ اسلامی سے متعلق کثیر لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو انھیں اپنا یہ سطحی خیال بدلنا پڑے گا کہ اسلامی قانونِ شریعت جامد اور ناقابلِ ارتقاء ہے۔ بدقسمتی سے، ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو وہ بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی اور فرقہ وارانہ نزاعات چھڑ جائیں گی۔ بایں ہمہ، میں مسئلۂ زیرِ نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔

(۱) سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ قرنِ اول سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں، قرآن کے علاوہ اور کوئی تحریری قانون موجود نہ تھا۔

(۲) یہ ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ پہلی صدی ہجری کے وسط سے لے کر چوتھی صدی کے آغاز تک، مسلمانوں میں قریب انیس مکاتبِ فقہ پیدا ہو چکے تھے۔ صرف اس ایک بات سے پتہ چل سکتا ہے کہ ایک بڑھتی ہوئی تہذیب کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے، ہمارے فقہاء نے کس قدر جدّوجہد سے کام لیا تھا۔ جوں جوں اسلامی فتوحات کا سلسلہ پھیلتا گیا اور مسلمانوں کا دائرۂ نظر وسیع ہوتا گیا، ہمارے ان قدیم فقہاء کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ ان اقوام کے احوال و ظروف اور عادات و اطوار کا مطالعہ کریں جو حلقہ بگوشِ اسلام ہوتی تھیں۔ اور اس طرح اپنے ماحول اور اس کے تقاضوں کا وسعتِ نظر سے جائزہ لیں۔ چنانچہ اگر اس زمانہ کی تمدنی اور سیاسی تاریخ کی روشنی میں مختلف مذاہبِ فقہ کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر

سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے فقہاء تعبیرِ احکام کے سلسلہ میں رفتہ رفتہ استخراجی طریق (Deductive) سے استقرائی طریق (Inductive) کی طرف آتے گئے۔

قانونِ شریعت کے مآخذ اربعہ

(۳) جب ہم شریعتِ اسلامی کے چار مسلمہ مآخذ (قرآن۔ حدیث۔ اجماع اور قیاس) اور ان سے پیدا شدہ نزاعات پر غور کرتے ہیں تو ہمارے مذاہب فقہ کے جامد ہونے کا مفروضہ بالکل بے اصل و بے بنیاد ثابت ہو جاتا ہے اور فقہ میں مزید ارتقاء اور نشوونما کا امکان واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔

آیئے۔ اب ان چار مآخذ شریعت کے متعلق مختصر طور پر غور کریں۔

(۱) قرآن

قرآن اسلام میں قانون کا اصلی سرچشمہ قرآن ہے۔ لیکن قرآن کوئی (تفصیلی) ضابطۂ قانون نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اس کا بنیادی مقصد، انسان کے دل میں، خدا اور کائنات کے ساتھ اس کے تعلق کے بلند شعور کو بیدار کرنا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن میں بعض اصول و ضوابط قانونی نوعیت کے بھی موجود ہیں۔ بالخصوص انسان کی عائلی زندگی کے متعلق قواعد و ضوابط، جس پر اس کی معاشرتی زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ جس وحی کے پیشِ نظر انسان کی بلند ترین زندگی ہے، اس میں یہ معاشرتی قواعد و ضوابط وحی کا جزو کیوں بنائے گئے، تو اس سوال کا جواب عیسائیت کی تاریخ میں ملے گا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ عیسائیت درحقیقت یہودیت کی آہن و رسوم کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی زندگی کے خلاف ردِ عمل تھی۔ اس کے لئے اس نے انسان کے سامنے دنیا چھوڑ کر عاقبت سنوارنے کا نصب العین رکھا اور اس میں اسے کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن اس نے اس طرح انفرادی زندگی کا جو تصور پیدا کر دیا۔ اس سے اس نے سمجھ لیا کہ انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کو روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ (جرمن فلاسفر) نومن اپنی کتاب (Brieff Uber Religion) میں لکھتا ہے کہ

> ابتدائی مسیحیت نے مملکت۔ قانون۔ معاشرہ اور پیداوار کے تحفظ کے مسائل کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس نے معاشرتی مسائل کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا

ان تصریحات کے بعد وہ آخر میں لکھتا ہے۔

> اب ہمارے لئے دو ہی صورتیں رہ گئی ہیں۔ یا تو ہم اس کا فیصلہ کر لیں کہ ہم بغیر کسی مملکت کے زندگی بسر کریں گے اور اس طرح اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں نوضویت اور لاقانونیت کے گرداب میں ڈال دیں گے۔ اور یا ہم اپنے مذہبی مسلک کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی مسلک کو بھی مقصدِ حیات بنالیں۔

غرض یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضروری سمجھا ہے کہ مذہب و مملکت۔ اور اخلاقیات و سیاست کو ایک ہی وحی کی لڑی میں پرو دیا

جائے۔ جس طرح افلاطون نے اپنی کتاب ری پبلک (جمہوریت) میں انھیں یکجا رکھنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن اس سلسلہ میں خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل، قرآن کا حرکیاتی نقطۂ نظر ہے۔ میں (اس سے پہلے) اس کے آغاز اور تاریخ کے متعلق تفصیلی طور پر کہہ چکا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو کتاب اس نقطۂ نگاہ کی حامل ہو، وہ ارتقاء کے تصور کے مخالف کبھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسکے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ زندگی صرف تغیر و تبدل ہی کا نام نہیں۔ اس کے اندر ایسے عناصر (Elements of Conservation) بھی ہیں جو اپنی حالت پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ انسان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے تخلیقی کارناموں سے لذت اندوز ہوتا ہے اور اپنی توانائیوں کو زندگی کی نئی نئی شاہراہوں کے انکشاف پر مرکوز رکھتا ہے۔ لیکن ان تمام کامرانیوں کے باوجود اُسے خود اپنی ذات کے انکشاف کے وقت کچھ تردد اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ وہ اپنی ترقی اور پیش قدمی میں اپنے ماضی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اور اپنی ذات کی داخلی کشاد سے اُسے کچھ ڈر سا محسوس ہوتا ہے[1]۔ وہ جب آگے بڑھتا ہے تو ایسی قوتیں جو اس سے متخالف سمت کی طرف جاتی دکھائی دیتی ہیں، اس کی روح کے سامنے روک بن کر حائل ہو جاتی ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ زندگی، اپنے ماضی کے پشتارے کو اپنی کمر پر لادے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ اس لئے جب بھی معاشرہ میں کسی تبدیلی کا سوال سامنے آئے تو قدامت پسندی کی قوتوں کی قیمت اور جس انداز سے وہ عمل پیرا ہوتی ہیں اس کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ لہٰذا ہمارے ہاں کے معقولیت پسند طبقہ کو چاہیئے کہ وہ جب معاشرہ کے مروجہ رسوم و مناسک (Institutions) میں اصلاح و تغیر کا خیال کرے تو قرآن کے اس اہم اصول کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھے۔ دنیا کی کوئی قوم اپنے ماضی کو یکسر مسترد نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ ان کی ذات کا تشخص ان کے ماضی کی بنا پر ہوتا ہے[2]۔

پس اسلام جیسے معاشرہ میں، مروجہ شعائر و مناسک (Institutions) میں تبدیلی کا سوال بہت نازک اور دشوار بن جاتا ہے جس سے ایک مصلح کی ذمہ داری بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے[3]۔ اپنی فطرت کے لحاظ سے اسلام کسی خاص خطۂ زمین سے پابستہ

---

[1] اپنی ذات کے انکشاف و کشود کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی انفرادیت (Individuality) سے باخبر ہو جاتا ہے اور اس طرح اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ وہ کسی بڑے کل (معاشرہ) کا جزو نہیں بلکہ اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے جس کی نشوونما معاشرہ کے اندر ہوتی ہے۔ وہ اپنے اس احساسِ انفرادیت سے گھبراتا ہے حالانکہ اگر وہ اسے بنظرِ غائر دیکھے تو یہ چیز اطمینان کا موجب ہونی چاہیئے نہ کہ گھبراہٹ کا سبب۔ وہ اپنی انفرادیت میں معاشرہ سے کٹ نہیں جاتا بلکہ اس کا اہم رفیق بن جاتا ہے۔ لہٰذا اسکی یہ گھبراہٹ اسکی کوتاہ بینی کی دلیل ہے۔

[2] ماضی سے وابستگی اور شے ہے اور ماضی کی پرستش اور چیز۔ ماضی سے وابستگی کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے پاس اسلاف کا جو سرمایہ منتقل ہو کر آئے ہم اس سے مستفید ہوں لیکن ماضی پرستی کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس سرمایہ پر کبھی تنقیدی نگاہ نہ ڈالیں۔

[3] کسی فرد کو ان تبدیلیوں کی اجازت ہی نہیں دی جا سکتی۔ یہ تبدیلیاں عند الضرورت صرف اسلامی نظام ہی کر سکتا ہے۔

نہیں۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ وہ مختلف نسلوں کے افراد کو (ایمان کے ذریعے) ایک مرکز پر اکٹھا کرے اور پھر ان ذرات کو ایک ایسی ملت میں تشکیل کر دے جسے شعورِ ذات کی نعمت حاصل ہو۔ اس طرح یہ ملت، تمام دنیا کے لئے ایک نمونہ بینگی یہ بتانے کے لئے کہ تمام نوعِ انسانی کس طرح ایک "امتِ واحدہ" بن سکتی ہے۔ یہ کام کچھ ایسا آسان اور سہل الحصول نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود، اسلام اپنے عدیم النظیر شعائر و ارکان (Institutions) کے ذریعے، تضاد و تخالف کے اس ہجوم (نوعِ انسانی) میں ایک اجتماعی عزم اور مجموعی ضمیر پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس قسم کے معاشرہ کے ارتقا میں، (اور تو اور) خورد و نوش اور پاک پلید جیسے عام معاملاتِ زندگی کے متعلق قوانین و ضوابط کا غیر متبدل ہونا بھی ایک خاص معنی اور قدر خویش رکھتا ہے۔ اس لئے کہ (جب مختلف طبائع اور متضاد اطوار کے افراد، ان احکام کی پابندی سے اپنے اندر یکسانیت پیدا کر لیتے ہیں تو) اس سے معاشرہ میں ایک خاص اندرونی یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ نیز، اس سے وہ داخلی اور خارجی وحدت اور ہم آہنگی قائم رہتی ہے جو ان قوتوں کا مقابلہ کرتی ہے جو اس قسم کے مختلف الاوضاع معاشرہ میں تشتت و انتشار پیدا کرنے کے لئے اندر ہی اندر سرگرمِ عمل رہتی ہیں۔ لہٰذا ان شعائر و مناسک پر تنقیدی نگاہ[1] ڈالنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اُس معاشرتی تجربہ کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کرے جس کی تشکیل اسلام کرتا ہے۔ وہ ان شعائر و مناسک پر غور و فکر کرتے ہوئے یہ نہ دیکھے کہ ان سے فلاں ملک کو کیا کیا معاشرتی فوائد حاصل ہوں گے یا نقصانات پہنچیں گے۔ وہ ان کا جائزہ اس عظیم مقصد کی روشنی میں لے جو پوری کی پوری انسانیت میں رو بکار ہوتا جا رہا ہے۔[2]

قانون سازی کیلئے قرآنی اصول

آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس، ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہا نے، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا

---

[1] جن شعائر و مناسک کا تعین خود قرآن نے کر دیا ہے ان پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس تنقید سے مراد ان رسوم و مناسک پر تنقید ہے جو خارج از قرآن ہیں۔

[2] مثلاً اذان کو لیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم (یا ملک) اجتماعِ صلوٰۃ کی دعوت کے لئے کسی اور طریقہ کے اختیار کرنے کا خیال کرے اور اس میں کوئی اپنی ملکی مصلحت دیکھے۔ لیکن اس سے وہ مقصد فوت ہو جائے گا جو تمام عالمِ اسلام میں اذان کی یکسانیت سے حاصل ہوتا ہے۔

حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہین منت تھا۔ چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انھیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہاد مطلق کے امکان سے انھیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکر انسانی کی نشوونما ارتقار سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی کامل، مختتم اور سہو و خطا سے بری سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دور حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصول اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرز عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقا ہے، اسکی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

[اس کے بعد علامہ اقبال نے ترکی کے انقلاب پسند شاعر ضیا کے ان سوالات کو لیا ہے کہ طلاق وراثت وغیرہ کے معاملات میں مردوں اور عورتوں کو مساوات حاصل ہونی چاہیئے اور ان پر مدلل بحث کی ہے۔ اس کے بعد وہ قانون شریعت کے دوسرے سرچشمہ۔ یعنی حدیث کی طرف آتے ہیں]

---

(۲) حدیث

حدیث اسلامی قانون شریعت کا دوسرا سرچشمہ حدیث نبوی ہے۔ احادیث، سابقہ زمانے میں بھی اور دور حاضر میں بھی کافی بحث و نزاع کا موضوع رہی ہیں۔ زمانہ حال کے نقادوں میں، گولڈزیہر نے، جدید اصول تنقید کی روشنی میں ان کی کافی جانچ پڑتال کی ہے جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ ذخیرہ بہ ہیئت مجموعی قابل اعتماد نہیں۔ ایک دوسرا مغربی مصنف ان اصولوں کا جائزہ لینے کے بعد جن کے مطابق مسلمان ائمہ جرح و تعدیل نے احادیث کو پرکھا ہے کہتا ہے کہ نظریاتی طور پر ان میں غلطی کا امکان ہے۔ لیکن اس کے بعد لکھتا ہے کہ

آخر میں میں کہوں گا کہ جن خیالات کا اظہار اوپر کیا گیا ہے۔ ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان اصولوں میں غلطی کا امکان نظری طور پر موجود ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب کہ حدیثوں کو اس طرح پرکھنے میں فی الواقعہ کس حد تک غلطیاں سرزد ہوئیں، اس بات پر منحصر ہے کہ جن حالات میں احادیث کی جانچ پڑتال ہوئی وہ کہاں تک اس کی ترغیب دلاتے تھے کہ غلطی کے امکان سے فائدہ اٹھالیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے حالات بہت کم تھے اور سنن کے ذخیرہ کا بہت کم حصہ ان سے متاثر ہوا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن احادیث کے مجموعوں کو مسلمان قانونی حیثیت دیتے ہیں، ان کا بڑا حصہ اسلام کے آغاز اور ارتقاء کا صحیح ریکارڈ ہے۔

(The Muhammaden Theories Of Finance)

لیکن مقصدِ زیرِ نظر کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان احادیث کو جن کی حیثیت قانونی ہے، ان احادیث سے جن کی قانونی حیثیت نہیں، الگ کرلیں۔ احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے

احادیث کی قانونی حیثیت

میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم ورواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرمادی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جاسکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم ورواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم ورواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرمادیا ہو) انھیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات واطوار اور رسوم ورواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اسکے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کردے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی انھیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کرلیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انھیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور ممیز استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات وخصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اسکے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ انھیں ٹالنے والی

نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالک اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحب اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے، جیسا کہ امام مالک اور ان کے بعد امام احمد بن حنبل نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محدثین نے قانون کے متعلق مجرد فکر و قیاس کے مقابلہ میں ٹھوس واقعات (Concrete Cases) کو زیادہ اہمیت دینے سے شرعی قانون کی بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ علاوہ بریں اگر احادیث کے لٹریچر کے غائر مطالعہ سے اس روح (اسپرٹ) کے سمجھنے کا کام لیا جائے جن کے مطابق رسول اللہؐ نے اپنی وحی کی تعبیر فرمائی تھی تو اس سے یہ بھی سمجھ میں آجائے گا کہ قرآن نے قانون سازی کے لئے جو اصول دیئے ہیں، زندگی کے عملی میدان میں ان کی صحیح قدر و قیمت کیا ہے۔ اگر ان اصولوں کی حیاتی قدر (Life-value) کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو اس سے شرعی قانون سازی کے بنیادی اصولوں کی تعبیرِ نو میں بڑی مدد ملے گی۔ یہی ایک چیز ہے جو اس باب میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

ان سے قانون سازی کی روح کو سمجھا جا سکتا ہے

(۳) اجماع

قانونِ شریعت کا تیسرا سرچشمہ اجماع ہے جو میرے نزدیک اسلام میں سب اہم قانونی تصور ہے[1]۔ لیکن یہ بات

---

[1] علامہ اقبال نے اس پوری بحث میں اجماع سے مراد اسلام کا مشاورتی نظام لیا ہے نہ کہ فقہا کا مصطلح "اجماع"۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اس بحث کو دیکھنا چاہیئے۔

کس قدر حیرت انگیز ہے کہ ابتدائے اسلام میں اس اہم قانونی تصور کے متعلق نظری بحثیں تو اس قدر ہوئیں۔ لیکن یہ صرف خیال ہی خیال رہا اور مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی ایک مستقل عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔ اغلباً اس کی وجہ یہ تھی کہ خلیفۂ چہارم کے بعد مسلمانوں میں جو ملوکیت آگئی تو اس نے سمجھ لیا کہ اجماع کو ایک قانونی حیثیت دینے سے اس کے سیاسی مفاد پر زد پڑے گی۔ میرا خیال ہے کہ بنی امیہ اور عباسی خلفاء نے اپنا مفاد اسی میں سمجھا کہ بجائے اس کے کہ افرادِ ملت (کے نمائندگان) کی ایک مستقل مجلسِ مشاورت (اسمبلی) متشکل کی جائے، جس سے وہ اتنا اقتدار حاصل کرے کہ اس (سلاطین کے لئے) در دِ سر بن جائے، مجتہدین کو انفرادی اجتہاد کا حق دیدیا جائے۔ لیکن اب یہ دیکھ کر بڑی ڈھارس بندھتی ہے کہ زمانہ کے جدید تقاضوں اور اقوامِ مغرب کے سیاسی تجربہ سے دورِ حاضر کے مسلمانوں کو اجماع کی قدر و قیمت اور امکان کا احساس پیدا ہوتا جارہا ہے۔ مسلمان ممالک میں روحِ جمہوریت کی بیداری اور رفتہ رفتہ مجالسِ قانون ساز کی تشکیل ایک نیک فال اور ترقی کی جانب صحیح اقدام ہے۔ دورِ حاضر میں جب کہ امت میں متعدد جماعتیں اور پارٹیاں پیدا ہو چکی ہیں اجماع کی ممکن شکل یہی ہے کہ مذاہبِ فقہ کے انفرادی نمائندگان سے حقِ اجتہاد چھین کر اسے مسلمانوں کی مجلس قانون ساز کو تفویض کر دیا جائے

اجماع کی صحیح شکل

اس سے، (دیگر مفاد کے علاوہ) ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ قانونی مباحث میں وہ غیر فنی اربابِ بصیرت بھی حصہ لے سکیں گے جنھیں (فنی نکات آفرینیوں کے مقابلہ میں) معاملات کی (عملی) سمجھ بوجھ کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم اپنے نظامِ قانون کو جمود و تعطل کے پنجہ سے نجات دلا کر اس میں خونِ زندگی دوڑا سکتے اور اسے پھر سے ایک ارتقائی اندازِ نظر عطا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس طریقِ کار کے اختیار کرنے میں ہندوستان میں دشواریاں پیدا ہوں گی۔ اس لئے کہ یہ امر مشتبہ ہے کہ ایک غیر مسلم اسمبلی کو اجتہاد کا اختیار دیا جا سکتا ہے۔[1]

قرآن اور اجماع

اجماع کے ضمن میں ایک دو سوال اور بھی پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دیا جانا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ کیا اجماعِ امت (جمہور کا فیصلہ) قرآنی احکام کو منسوخ کر سکتا ہے؟ مسلمانوں کے مجمع میں اس سوال کا اٹھانا یکسر غیر ضروری ہے (کیونکہ ان میں سے ہر ایک اس حقیقت سے باخبر ہے کہ قرآنی احکام کو کوئی بھی منسوخ نہیں کر سکتا) لیکن مجھے اس سوال کو اس لئے سامنے لانا پڑا ہے کہ Mohammedan Theories Of Finance; کے مغربی مصنف نے اپنی اس کتاب میں ایک بڑی گمراہ کن بات لکھدی ہے۔ اس نے بغیر کسی حوالہ اور سند کے لکھدیا ہے کہ بعض حنفی اور معتزلہ مصنفین کے نزدیک اجماع، قرآن کو منسوخ کر سکتا ہے۔ سارے اسلامی لٹریچر میں اس بات کے جواز و تائید میں کوئی چیز نہیں ملی۔ (اجماعِ امت تو ایک طرف) قرآن کو تو رسول اللہؐ کی کوئی حدیث بھی منسوخ نہیں کر سکتی۔ میرا خیال ہے

---

[1] تشکیلِ پاکستان نے ان دشواریوں کو دور کر دیا تھا لیکن ہم نے اپنے آئین کی رو سے غیر مسلموں کو مجالسِ قانون ساز میں شریک کر کے، ان دشواریوں کو خود اپنے ہاتھوں پیدا کر لیا۔

کہ اس مغربی مصنف کو جس بات نے مغالطہ میں ڈالا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے متقدمین نے اپنی تحریروں میں نسخ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ امام شاطبی نے الموافقات (جلد سوم۔ صفحہ ۹۵) میں لکھا ہے، صحابہ کے اجماع کے سلسلہ میں جب نسخ کا لفظ آئے تو اس سے مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قرآن کے فلاں حکم کو فلاں حد تک نافذ کیا یا اسے فلاں دائرہ تک محدود رکھا (یعنی احکامِ قرآنی کی تقیید و تعمیم[1]) اس سے ہرگز یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ انھوں نے قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر دیا یا اس کی جگہ کوئی دوسرا حکم نافذ کر دیا۔ اس تحدید و توسیع کے سلسلہ میں بھی بقول آمدی، نظریہ قانون یہ ہے کہ صحابہؓ کے پاس اس کیلئے کوئی نہ کوئی حکمِ شریعت ضرور ہوگا[2] (آمدی، شافعی امام فقہ ہیں جن کی وفات ساتویں صدی کے وسط میں ہوئی تھی اور حال ہی میں مصر سے ان کی کتابیں شائع ہوئی ہیں)

صحابہؓ کے فیصلوں کی حیثیت

لیکن فرض کیجئے کہ کسی معاملہ میں صحابہؓ نے بالاتفاق ایک فیصلہ کیا۔ تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آنے والی نسلیں بھی اس فیصلہ کی پابند رہیں گی؟ امام شوکانی نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مختلف مذاہب فقہ کے ائمہ کی آرا بھی نقل کی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس باب میں ضروری ہے کہ اُن امور میں جن کا تعلق واقعات (Facts) سے ہے اور اُن میں جن کا تعلق قانون سے ہے، فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جن امور کا تعلق (عہدِ رسالت یا زمانۂ صحابہ کے) واقعات و حوادث سے ہے اُن میں صحابہؓ کے فیصلوں کی پابندی ہم پر لازم ہے۔ اس لئے کہ اُس زمانے کے واقعات کا علم صحابہؓ سے زیادہ اور کسی کو نہیں ہو سکتا تھا۔ مثال کے طور پر اُس واقعہ کو لیجئے جس میں یہ سوال اٹھا کہ کیا قرآن کی وہ سورتیں جنہیں معوذتین کہا جاتا ہے قرآن کا حصہ ہیں یا نہیں۔ اور صحابہؓ نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ یہ قرآن کا جزو ہیں۔ لیکن جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جن کی حیثیت قانونی ہے، ان کی بابت میری ناچیز رائے یہ ہے کہ بعد میں آنے والی نسلیں صحابہؓ کے فیصلوں کی پابند نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس میں سوال (قرآن کے کسی اصولی حکم کی) تعبیر کا ہے۔ چنانچہ امام کرخی اس خیال کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "سنتِ صحابہؓ صرف ان معاملات میں واجب الاتباع ہے جن کا فیصلہ قیاس سے نہیں کیا جا سکتا۔ جن معاملات کا فیصلہ (اجتہاد و) قیاس سے کیا جا سکتا ہے اُن میں اُن کی سنت کی تقلید لازم نہیں۔"

اس ضمن میں ایک اور سوال پوچھا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ بحالاتِ موجودہ مسلمانوں کی جو مجالس قوانین ساز

---

[1] مثلاً حضرت عمرؓ نے جنگ کے دوران میں حد نافذ کرنے کو ملتوی کر دیا تھا۔ یا قحط کے زمانہ میں ان لوگوں کو چوری کی سزا نہیں دی تھی جنھوں نے بھوک کی وجہ سے غلہ کی چوری کی تھی۔

[2] یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ صحابہ کے پاس "حکم شرعی" ہونے سے کیا مراد ہے۔ انھوں نے قرآن کی تعلیم سے ایک استنباط کیا ہوگا۔ اور ایسا استنباط ہو سکتا ہے، ان کا ایسا فیصلہ (جو قرآن کے اصولوں کے اندر ہو) خود حکم شرعی کی حیثیت رکھتا تھا۔

ہماری مجالس قوانین ساز

بنائی جائیں گی ان میں لامحالہ ایسے لوگ آجائیں گے جو قانونِ شریعت کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی مجالس سے قانونِ شریعت کی تعبیرات میں فاش غلطیاں سرزد ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی غلطیوں کے سدباب، یا ان کے مواقع کو کم کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟ (اس سلسلہ میں) ایران نے اپنے ۱۹۰۶ء کے دستورِ مملکت کی رُو سے "ایسے علماء کی" جو امورِ دنیا سے باخبر ہوں" ایک کمیٹی مقرر کی تھی تاکہ وہ مجالسِ قانون ساز کے کام کی نگرانی کرے۔ یہ تدبیر بڑی خطرناک تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے ایران کے نظریۂ دستور کے حالاتِ خصوصی کے پیشِ نظر اختیار کیا گیا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کا نظریۂ دستور یہ ہے کہ مملکت درحقیقت امامِ غائب کی ملک ہے اور بادشاہ صرف اس کا محافظ ہے، علمائے مذہب بہ حیثیت نمائندگانِ امامِ غائب، اپنا حق سمجھتے ہیں کہ وہ ملت کی زندگی کے ہر گوشے کے محاسب و نگراں ہوں۔ اگرچہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جب امامِ غائب کی جانشینی کو تسلیم نہیں کیا جاتا تو ان علماء کے حق نیابت کو کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ بہرحال ایران کا نظریۂ دستور کچھ ہی ہو، یہ تدبیر خطرات سے خالی نہیں[1] اگر کوئی سُنی مملکت اس تدبیر کو آزمائشی طور پر اختیار کرنا چاہے، تو وہ اسے عارضی طور پر آزما کر دیکھ لے۔ وہ بھی اس طرح کہ علما کو مجلسِ قانون ساز کا رکن بنا دیا جائے تاکہ وہ قوانین شریعت پر آزادانہ بحث و تمحیص میں دوسروں کی معاونت اور راہ نمائی کریں۔ احکامِ شریعت میں غلطیوں کے سدباب کا موثر طریق ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان ممالک میں قانونی تعلیم کے موجودہ طریق میں ایسی اصلاح کی جائے جس سے اس کا دائرہ وسیع ہو جائے اور جدید اصولِ قانون سازی کو طلباء کے درس کا لازمی جزو قرار دیا جائے۔

(۴) قیاس

قیاس

فقہ کا چوتھا بنیادی ماخذ قیاس ہے۔ یعنی کسی ایک حکم یا فیصلہ کو، عقل و بصیرت کی رُو سے، اس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا۔ (عہدِ رسالت مآبؐ کے بعد) جو ممالک اسلامی فتوحات کے دائرے میں آئے ان میں معاشرتی اور زرعی حالات، عرب کے لوگوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان معاملات کی نزاعات کے تصفیہ کے لئے، اُن نظائر سے کچھ مدد نہیں مل سکتی تھی جو احادیث کے مجموعوں میں مندرج تھے۔ اس دشواری کے پیشِ نظر، مذہب حنفی کے لئے اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا کہ وہ قانونی تعبیرات میں قیاس اور رائے سے کام لیں۔ عراق میں جو نئے حالات سامنے آئے ان کے

ارسطوی منطق

پیشِ نظر انھوں نے یہی سمجھا کہ اگر قانون سازی میں ارسطوی منطق سے کام لیا جائے تو کامیابی ہو سکتی ہے لیکن قانونِ شریعت کی تدوین کے ابتدائی مراحل میں یہ طریقِ کار بہت نقصان رساں تھا۔ ارسطوی

---

[1] ہمارے نومسلم مصنف اسد لیوپولڈ نے اپنے مسودۂ دستورِ پاکستان میں اس قسم کی مجلسِ علماء کی تجویز پیش کی تھی جسکی طلوع اسلام نے مخالفت کی تھی۔ نیز پہلی مجلسِ دستور ساز کی کمیٹی نے بھی کچھ اس قسم کی تجویز کی تھی۔ مقامِ شکر ہے کہ دستورِ پاکستان میں اس قسم کی کوئی شق نہیں رکھی گئی۔

منطق کے معنی یہ ہیں کہ عام اصولوں سے ایسے قواعد وضوابط مستنبط کئے جائیں جن میں کہیں لوچ اور لچک نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ طرق واعمالِ حیات کچھ ایسے پیچیدہ واقع ہوئے ہیں کہ انہیں اس قسم کے سخت قواعد وضوابط کے شکنجے میں کسا نہیں جا سکتا لیکن اگر زندگی کو ارسطو کی منطق کی عینک سے دیکھا جائے تو وہ ایک مشین محض دکھائی دیتی ہے جس میں کوئی داخلی اصلِ حرکت کارفرما نہیں۔ مذہب حنفیہ کے ائمہ نے حیات کی تخلیقی آزادی اور خودروی کو نظرانداز کر دیا۔ اس سے انہیں امید بندھتی تھی کہ خالص منطق کی بنیادوں پر ایک مکمل ضابطۂ قوانین کی تشکیل کی جا سکے گی۔ یہ طریقِ کار فقہائے حجاز کے فطری میلان کے خلاف تھا (عربی فطرت اس قسم کی جامد یا بے لچک بندیوں کو قبول ہی نہیں کر سکتی تھی)۔ چنانچہ انھوں نے فقہائے عراق کی اس قسم کی قانونی موشگافیوں کے، اور ان کے اس رجحان کے خلاف کہ محض قیاسی اور فرضی مقدمات کو سامنے رکھ کر قانون بناتے چلے جائیں، صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ سمجھتے تھے (اور بجا طور پر سمجھتے تھے) کہ اس طرح اسلام کا قانون ایک بے جان مشین ہو کر رہ جائے گا۔ ان ائمہ فقہ کی اس قسم کی باہمی نزاعات سے یہ بحثیں چھڑ گئیں کہ قیاس کے حدود کیا ہیں، کن حالات میں قیاس جائز ہے۔ غلط قیاس کی تصحیح کس طرح کی جا سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان بحثوں کی ضرورت اس لئے بھی لاحق ہو گئی کہ شروع میں قیاس کے متعلق صرف اتنا ہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ ایک مجتہد کی ذاتی رائے کا نام ہے۔ لیکن آخر الامر یہی چیز قانونِ اسلام میں سرچشمہ حیات و عمل بن گئی۔ آریائی ذہنیت و رجحانِ طبع یہ ہے کہ انسان تصورات کی خیالی دنیا میں مگن رہے اور واقعات و ممکنات کی دنیا سے کم دلچسپی لے۔ یہ ذہنیت زندگی کے عملی مسائل کے مقابلہ میں نظری مسائل کے متعلق بحث و تمحیص سے زیادہ لذت اندوز ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، سامی رجحانِ طبع دنیائے واقعات سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے اور تصورات کی بجائے ٹھوس حقائق پر قابو پانا چاہتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو امام ابوحنیفہؒ کے اس مسلک پر کہ قیاس، قانون کا ماخذ ہے، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی کڑی تنقید آریائی ذہنیت پر سامی احتساب ہے[1]۔ بالفاظِ دیگر، یہ ایک نزاع تھی قانون کی تحقیق میں، استقرائی اور استخراجی اسلوب کے حامیوں کے درمیان۔ شروع میں، فقہائے عراق، تخیلِ قانون کی ابدیت پر زیادہ زور دیتے رہے۔ ان کے برعکس، حجاز کے فقہاء نے اس کے موقتی (Temporary) گوشہ پر زور دیا لیکن انھوں نے اپنی پوزیشن کی اہمیت کا کماحقہٗ احساس نہ کیا۔ وہ چونکہ حجاز کے بسنے والے تھے اس لئے طبعی طور پر وہ حجاز کی قانونی روایات کے طرفدار ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انھوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انھوں نے

---

[1] امام ابوحنیفہؒ کا تعلق ایرانی نسل سے تھا اور امام مالکؒ اور شافعیؒ سامی النسل تھے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس میں افرادِ متعلقہ کے ذاتی رجحان کی بجائے حالات کے تقاضے زیادہ ذمہ دار تھے۔ جیسا کہ خود علامہ نے آگے چل کر بیان کیا ہے۔

(ایک خاص دَور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا۔ اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہب حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انھوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعبیریں زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتبِ فقہ جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا۔ اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہب فقہ و تشریع کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ کے ناقدین نے، ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالت مآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔

اس مکتبِ فقہ کا خاص الخاص اصول۔ قیاس۔ بشرطیکہ اسے اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے، امام شافعیؒ کے الفاظ میں اجتہاد ہی کا دوسرا نام ہے۔ جس کی وحی کی چار دیواری کے اندر، پوری پوری آزادی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ ایک اصول قانون کی حیثیت سے اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ــــ جیسا کہ بعض علماء بالخصوص قاضی شوکانی نے لکھا ہے۔ خود نبی اکرمؐ کی زندگی میں بھی اس کی اجازت تھی۔ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افترا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی۔ اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسانوں کی بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افترا" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انھوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا، یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسی (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں۔

> اگر اس افترا کے داعی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے

کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہ تھا)

مجھے امید ہے کہ ان مختصر تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ ہمارے نظامِ قانون کے نہ اساسی اصولوں میں اور نہ ہی ان کے اوپر اٹھی ہوئی موجودہ عمارت میں کوئی چیز ایسی ہے جو ہمارے موجودہ طرزِ عمل کے لئے وجۂ جواز بن سکے (جس کے مطابق سمجھا جاتا ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں)۔ بنابریں، دنیائے اسلام کو چاہیئے کہ وہ جرأت و لبالت سے کام لے اور فکرِ عمیق اور تجرباتِ جدیدہ کی روشنی میں نظامِ شریعت کی تشکیلِ نو کے اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔ اس سلسلہ میں اس نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ تشکیلِ جدید کے معنی صرف اسی قدر نہیں کہ زمانہ کے موجودہ حالات سے مطابقت پیدا کرلی جائے۔ اس کا ایک گوشہ اس سے بھی زیادہ اہم اور نازک ہے۔ گذشتہ جنگِ عظیم (پہلی جنگِ عظیم) اپنے پیچھے دو اہم اثرات چھوڑ گئی ہے۔ ایک تو ترکی کی بیداری ـــ جس کے متعلق ایک فرانسیسی مصنف نے کہا ہے کہ وہ دنیائے اسلام میں ثبات و استحکام کا عنصر ہے ـــ اور دوسرے وہ معاشی تجربہ جو مسلم ایشیا کے پہلو (روس) میں ہو رہا ہے۔ یہ وہ کوائف ہیں جن سے ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ اسلام کا حقیقی مفہوم کیا ہے اور وہ انسانیت کو کس منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ آج عالمِ انسانیت کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔

جرأت کی ضرورت ہے

عالمِ انسانیت کے تقاضے

(۱) کائنات کی روحانی تعبیر۔

(۲) فرد کی روحانی آزادی، اور

(۳) عالمگیر اصولِ اساسی جو انسانیت کو روحانی بنیادوں پر نشوو ارتقاء کے راستے پر ڈال دیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ جدید یورپ نے ان بنیادوں پر چند تصوراتی نظام قائم کئے ہیں۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ جن صداقتوں کو محض عقل کی رو سے دریافت کیا جاتا ہے ان سے (قلبِ انسانیت میں) زندہ و پائندہ ایمان کا وہ شعلہ کبھی بیدار نہیں ہوتا جو وحئ نبوت کی رو سے ظہور میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محض عقل، لوگوں کو بہت کم متاثر کر سکی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مذہب نے ہمیشہ افراد کو بھی بلندیاں عطا کی ہیں اور پورے کے پورے معاشرے میں بھی انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یورپ کی تصوریت (جسے اس نے خالص عقل کی رو سے قائم کیا ہے) اس کی زندگی میں کبھی ایک زندہ عنصر نہیں بن سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں ایک بدنہاد اور مسخ شدہ انانیت (Perverted Ego) ان جمہوریتوں کے پیکر میں نمودار ہو گئی ہے جو باہمدگر متصادم ہیں اور جن کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ دولتمندوں کی عیش سامانیوں کی خاطر غریبوں کو لوٹا کھسوٹا جائے۔ یقین مانیئے! انسانیت کی اخلاقی ترقی کے راستے میں آج سب سے بڑی

رکاوٹ یورپ ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے پاس، وحی کے تصدق، وہ بنیادی تصورات موجود ہیں (جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور جن کی آج انسانیت کو اس قدر ضرورت ہے)۔ وحی کا سرچشمہ اعماقِ حیات ہے۔ اس کے حروف و الفاظ کے لباس میں اسکی اہم حقیقتیں مستور ہیں۔ اس میں الفاظ و معانی میں وہی اختلاط ہے

جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

زندگی کی روحانی بنیاد مسلمان کا ایمان ہے۔ ایسا ایمان جس کی خاطر، ہم میں سے کم سے کم پڑھا لکھا آدمی بھی بلا توقف و تامل، اپنی جان تک دے دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے[1] پہلے زمانے کے مسلمان جو اشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختم نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے۔ اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھائے جو اسلام کی اصل غایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔ (ختم شد)

[اگر پاکستان نے یہ کچھ کر دیا تو وہ اسلام کی روح کا سب سے بہتر ترجمان اور نوعِ انسانی کا سب سے بڑا محسن ہوگا۔ اگر وہ اس میں ناکام رہا تو یہ خود اپنے خلاف سب سے بڑی دشمنی اور انسانیت کے خلاف بہت بڑی غداری ہوگی۔

جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں، حکومت پاکستان کی طرف سے ایک کمیشن مقرر کیا جانے والا ہے جس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ بتائے کہ ملک کے موجودہ قوانین کو "کتاب و سنت" کے مطابق کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ملک میں اس مسئلہ کو وہ اہمیت نہیں دی جا رہی جس کا یہ متقاضی ہے۔ قوم کے عوام بیچارے روٹی کے دھندے میں اس قدر الجھے ہوئے ہیں کہ انھیں کسی اور طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں۔ خواص کو اپنی اپنی جاگیریں اور کرسیاں سنبھالنے کی فکر چین نہیں لینے دیتی۔ لہٰذا ملت اور ملک کے مستقبل کے متعلق سوچے تو کون سوچے؟ ہمارے اربابِ اقتدار کے سامنے ایک ہی سوال ہے اور وہ یہ کہ آئندہ الیکشن میں انھیں زیادہ سے زیادہ ووٹ کس طرح مل سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ (۱) ووٹ عوام سے ملیں گے اور (۲) عوام پر قدامت پرست اربابِ شریعت کا اثر ہے۔ اس لئے ہمارے اربابِ اقتدار، قدامت پرست طبقہ

---

[1] یعنی ہم صرف ان غیر متبدل اصولوں کے پابند ہیں جو خدا نے آخری بار قرآن میں متعین کر دیئے ہیں۔ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ہم ہر طرح سے آزاد ہیں کہ زندگی کے نئے تقاضوں کے مطابق اپنے معاشرہ میں مناسب تغیر و تبدل کرتے رہیں۔

کو ضرور ساتھ رکھنا چاہتے ہیں (جیسا کہ انھوں نے دستور سازی کے سلسلہ میں کیا ہے)۔ ہمیں اس سے کچھ واسطہ نہیں کہ کون کسے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اس سے ملت اور مملکت پر جو اثر پڑے گا، ہمیں اس کا شدید احساس ہے۔ ہمیں خطرہ یہ ہے کہ اگر قانون سازی کا کام قدامت پرست طبقہ کے سپرد کر دیا گیا تو یہاں بھی وہی کچھ ہوگا جو ٹرکی میں ہوا تھا۔ آپ کو معلوم ہے ٹرکی میں کیا ہوا تھا؟ مصطفےٰ کمال نے علماء حضرات سے کہا کہ وہ ایک متفقہ علیہ ضابطہ قوانین مرتب کر کے دیں جو دورِ حاضر کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکے۔ علماء حضرات چھ ماہ تک باہمی سر پھٹول میں مصروف رہے اور (جیسا کہ ظاہر ہے) ایسے قانون کی کوئی شق بھی تیار نہ کر سکے۔ مصطفےٰ کمال نے تنگ آ کر کہا کہ میں ملک کو کب تک لاقانونیت کی حالت میں رکھوں؟ آپ اپنی نزاعات میں الجھے رہیے۔ ہم اپنی سوچ بچار سے خود قانون مرتب کر لیں گے۔ اس طرح ٹرکی نے حکومت سے مذہب کو الگ کر کے، سیکولر انداز اختیار کر لیا۔ اگر یہاں بھی قانون سازی کا کام قدامت پرست طبقہ کے سپرد کر دیا گیا تو اول تو وہ کوئی متفقہ علیہ قانون بنا ہی نہیں سکیں گے۔ اور اگر کوئی ایسا قانون بنا بھی لیا گیا تو وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔ اسلئے ناقابلِ عمل ہوگا۔ اس سے ہمارے ارباب اقتدار کو ایک (جائز) عذر مل جائے گا کہ یہاں بھی سیکولر انداز کا قانون کیوں نہ رائج کر لیا جائے۔

ان تمام مشکلات کا حل فقط ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ قانون سازی کے لئے وہی اصول اختیار کیا جائے جس کی نشاندہی علامہ اقبالؒ نے کی ہے اور جس کی طرف طلوع اسلام شروع سے دعوت دیتا چلا آ رہا ہے۔ یعنی سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے لئے قرآن کریم کون سے غیر متبدل اصول دیتا ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ ہمارے دور کے تقاضے کیا ہیں۔ اور انھیں ہم ان غیر متبدل اصولوں کی حدود کے اندر کس طرح پورا کر سکتے ہیں، بایں نمط کہ پہلے یہ پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی معاشرہ بنا سکیں اور اس کے بعد پوری انسانیت کو اپنے دامن میں لے سکیں۔ اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیئے کہ فقہ اور روایات اور ان سے متعلقہ لٹریچر میں جو کچھ ہمیں ملتا ہے، وہ ان تقاضوں کو پورا کرنے میں کس حد تک ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ ان تمام عناصر کی روشنی میں ایک ضابطۂ قوانین مدون کیا جائے۔ اسے کہا جائے گا اسلامی قوانین شریعت کا ضابطہ۔ ظاہر ہے کہ اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے ان لوگوں کی بھی ضرورت ہوگی جو قرآن اور عصرِ حاضر کے تقاضوں پر نگاہ رکھتے ہوں اور ان کی بھی جنھیں ہمارے قدیم لٹریچر پر عبور ہو۔ اس قسم کے اربابِ فکر و نظر اور حضراتِ علم و فن کے باہمی تعاون سے یہ ضابطۂ قوانین مرتب ہو سکے گا۔ اگر ہمارا مجوزہ لائحہ عمل اس قسم کے عناصر کا مجموعہ اور ایسے تعاون کا مظہر ہوا، تو اس سے درخشندہ نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ورنہ

—— کارِ طفلاں تمام خواہد شد۔ طلوع اسلام]

اس پمفلٹ کے علاوہ

حسب ذیل پمفلٹس بھی دیکھئے

جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے اہم اور ضروری سوالات کے متعلق اسلام کیا کہتا ہے۔

روٹی کا مسئلہ ایسا مسئلہ نہیں جس سے مسلمان کچھ جھینپ محسوس کریں۔ اسلام نے معاشی مسئلہ کو جس قدر اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس پمفلٹ سے لگ سکے گا۔ قیمت ۲ر

علماء کون ہیں؟ عربی مدرسوں کے فارغ التحصیل نہیں بلکہ وہ حضرات ہیں جو ارض وسماوات میں خدا کی پھیلی ہوئی آیات پر غور وفکر کرتے ہیں اور ان سے صحیح نتائج تک پہونچتے ہیں۔ قیمت ۲ر

تکذیب دین کون کرتا ہے؟ وہ لوگ نہیں جو علانیہ اسلام کا انکار کر دیتے ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زبان سے اسلام کا اقرار کرتے ہیں۔ لیکن معاشرتی زندگی میں گریز کی راہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ قیمت ۲ر

اطاعتِ رسول! اسلام میں رسول کی اطاعت سے کیا مراد ہے۔ ایک نہایت اہم سوال کا بہت واضح جواب۔ قیمت ۲ر

بانۂ زندگی محترم پرویز صاحب کا وہ بصیرت افروز خطبہ جس سے موصوف نے طلوع اسلام کنونشن لاہور کو خطاب کیا۔ حسن وحقائق کا مرقع۔ قیمت ۲ر

تقدیرِ اُمم قوموں کی موت وحیات کے قرآنی اصول کیا ہیں۔ صلاحیت اور جدوجہد کی اہمیت۔ دولت کی صحیح تقسیم اور استخلاف فی الارض جیسے اہم مباحث۔ قیمت ۲ر

جنسیات قوموں کے تمدن (کلچر) پر جنسیات کا کیا اثر پڑتا ہے۔ دورِ حاضر کی جدید تحقیقات کی روشنی میں قرآنی راہ نمائی کی ابدیت وصداقت کا اثبات۔ ایک نازک مسئلہ کا لطیف ترین تجزیہ۔ قیمت ۲ر

مقامِ محمدیؐ حضور سرورِ کائنات، انسانیت کے کس بلند مقام پر فائز تھے۔ اور معراجِ محمدیؐ سے کیا مقصود ہے؟ مقالہ نہیں بلکہ جناب پرویز کو حضور رسالت مآبؐ سے جو والہانہ عشق ہے اس کا بادہ لبریز ہے جو بے ساختہ چھلک پڑا ہے۔ قیمت ۲ر

ناظم ادارۂ طلوع اسلام
۱۵۹/۳۔ ایل (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹

روٹی کا مسئلہ

(اقبال کی نظر میں)

اقبال نے اپنے آپ کو "شاعرِ فردا" کہا تھا چونکہ قوموں کی زندگی میں امروز و فردا صدیوں کے پیمانے سے ناپے جاتے ہیں اسلئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اُس فردا کا طلوع کب ہوگا جب مسلمان اقبال کے صحیح مقام اور اسکے پیغام کے صحیح مفہوم سے آشنا ہو سکے گا لیکن یہ حقیقت تو ابھی سے بے نقاب ہونا شروع ہو گئی ہے کہ اقبال "دیارِ غیر" کا شاعر تھا۔ چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ انگلستان، فرانس جرمنی اور اٹلی میں اقبال کے کلام کے ترجمے شائع ہو رہے ہیں اور اسکی شرحیں لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن خود پاکستان میں یہ حالت ہے کہ سال بھر کے بعد اپریل کے مہینے میں دو چار مقامات پر انفرادی طور پر "یومِ اقبال" کے جلسے منعقد کر لئے جاتے ہیں اور اس کے بعد اس "دفترِ بے معنی" کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ دورانِ سال میں اتنا ہوتا ہے کہ کبھی کسی قوال نے اقبال کی کوئی غزل گا دی یا کبھی ریڈیو والوں نے اپنے پروگرام کا خلا پُر کرنے کے لئے اس کی کوئی نظم سُنا دی۔ حتیٰ کہ وہ بزمیں اور اکاڈمیاں جنہیں اقبال کے نام پر لاکھوں روپے مل رہے ہیں، وہ بھی کھیل تماشے سے زیادہ کچھ نہیں کر رہیں۔ یوں یاد قائم رکھی جا رہی ہے اُس شخص کی جس نے (اور تمام باتوں کو چھوڑیئے) اس قوم کو اُس پاکستان کا تصور دیا جس سے اب اسکی زندگی وابستہ ہے اور جس کی وجہ سے اسے وہ مواقع حاصل ہو گئے ہیں کہ اگر یہ چاہے تو دنیا کی ممتاز ترین قوموں کی صف میں جگہ پا سکتی ہے۔ اتنی بڑی احسان فراموشی مسلمانوں ہی سے ظہور میں آسکتی تھی!

ہمارے نزدیک اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قوم کو پھر سے قرآن سے آشنا کرانے میں مسلسل جد و جہد کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مملکتِ پاکستان بھی ایک گراں بہا نعمت ہے لیکن اقبال کے الفاظ میں مملکت ایک کوشش ہوتی ہے (قرآنی) نصب العینی اصولوں کو زمان و مکان میں صورت پذیر کرنے کی۔ یہ آرزو ہوتی ہے ان اصولوں کو کسی خاص انسانی ادارہ میں روبہ عمل لانے کی؛ یعنی اسلامی نقطۂ نگاہ سے مملکت کی اہمیت محض اس لئے ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کے ان بلند مقاصد کو جنہیں قرآن نے عطا کیا ہے عملی پیکروں میں ڈھالنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قرآن کے ان بلند مقاصد کو

قوم کے سامنے بے نقاب کیا اور انھیں بتایا کہ ان کی زندگی اور سرفرازی کا راز انہی مقاصد کی عملی تشکیل میں ہے۔

قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے بلند مقاصد کو اصولی طور پر بیان کرتا ہے اور ان کی جزئیات کو بالعموم غیر متعین چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ قرآن پر عمل کرنے والی قوم ان جزئیات کو اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں خود متعین کر لی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس دور میں زندگی کا کوئی تقاضہ نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس تقاضے سے متعلق قرآن کے اصول بھی نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ ہمارے دور میں انسانی زندگی کے جس تقاضے نے سب سے زیادہ نمایاں حیثیت اختیار کی ہے وہ روٹی کا مسئلہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب سے انسان نے تمدنی زندگی شروع کی ہے روٹی کا مسئلہ اس کے ساتھ ساتھ رہا ہے۔ لیکن اس مسئلے نے ایک عالمگیر تقاضے کی حیثیت ہمارے ہی دور میں اختیار کی ہے۔ یہ غیر ممکن تھا کہ اقبال جو زندگی کے تقاضوں پر قرآن کی روشنی میں غور کرتا تھا اپنے دور کے لیے اہم تقاضے سے غیر متاثر رہتا اور قرآن نے اس باب میں جو راہ نمائی دی ہے اسے پیش نہ کرتا! اقبال کا پہلا دور ان بڑھتے ہوئے تقاضوں سے متاثر ہونے کا ہے۔ دوسرا دور اس حل پر غور و فکر کرنے اور اسے قرآنی روشنی میں پرکھنے کا ہے جو تنہا عقل انسانی نے اس مشکل کے لئے دریافت کیا۔ اور تیسرا وہ دور ہے جس میں اس نے اس مشکل کا قرآنی حل پیش کیا ہے۔ اس دور اول کی ابتداء اس وقت ہوتی ہے جب وہ خضر سے سوال کرتے ہیں کہ

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے؟　　اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور اسکے جواب میں خضر کہتا ہے ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے　　خضر کا پیغام کیا! ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر　　شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے　　مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس کے بعد پیام مشرق میں دیکھیے۔ وہ "صحبت رفتگاں" کے عنوان میں ٹالسٹائی، کارل مارکس، ہیگل، مزدک، کوہکن وغیرہ سب کو جمع کرتے ہیں اور ان کی زبان سے اس اہم تقاضے کی ترجمانی مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے کرتے ہیں۔ ٹالسٹائی کہتا ہے ؎

بارکش اہرمن لشکری شہریار　　از پئے نانِ جویں تیغِ ستم برکشید
دار دے بیہوشیش تاج، کلیسا، وطن　　جانِ خدادار را خواجہ بجامے خرید

کارل مارکس کہتا ہے ؎

راز دان جزو کل از خویش نامحرم شدست　　آدم از سرمایہ داری قاتل آدم شدست

ہیگل اپنا فلسفہ اضداد پیش کرتا ہے، اور ٹالسٹائی اسے "عقلِ دو رو" کی چابک دستی قرار دے کر اس کی تردید کرتا ہے۔ مزدک اعلان کرتا ہے کہ ؎

دورِ پرویزی گزشت اے کشتۂ پرویز خیز — نعمتِ گم کردۂ خود را ز خسرو باز گیر

فرانسیسی فلاسفر کونٹ مزدور کو یہ سبق دیتا ہے کہ ـــ نیاید ز محمود کارِ ایاز ـــ اور مزدور ایک پر معنی تبسم سے جواب دیتا ہے کہ ـــ

حق کوہکن دادی اے نکتہ سنج — بہ پرویز پرکار نابردہ رنج

آخر میں "قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" میں وہ ان دونوں کا تقابل نہایت وضاحت اور خوبصورتی سے کرتا ہے۔ جہاں سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ ـــ

غوغائے کارخانۂ آہن گری ز من — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شہ خراج بر و می نہد ز من — باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
ایں خاک و آنچہ در شکمِ او از آنِ من — وز خاک تا بہ عرشِ معلیٰ از آنِ تو

اور اسکے بعد "نوائے مزدور" میں کہتا ہے کہ ـــ

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز — مئے کہ شیشہ گداز د بہ ساغر اندازیم
مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم — بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم — بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

یہی دعوتِ انقلاب ہے جسے ہم "زبورِ عجم" میں اس سے بھی تیز انداز میں دیکھتے ہیں، جہاں اقبال کہتا ہے کہ ـــ

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب — از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام — آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

بالِ جبریل میں "فرشتوں کا گیت" اسی نظامِ سرمایہ پرستی کی تباہ انگیزیوں کے خلاف صدائے احتجاج ہے، جس میں کہا گیا ہے

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر — تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست — بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

یہی وہ احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ ـــ

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اسی کتاب میں لینن کی وہ مشہور درخواست بھی ہے جس میں وہ خدا سے کہتا ہے کہ ؎

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

یہ ہیں نظامِ سرمایہ پرستی کے انسانیت سوز نتائج، جنھیں اقبال کی نگہ بصیرت نے بھانپا اور جو اس کے قلبِ حساس کی گہرائیوں سے نشتروں کی شکل میں سطح سے اوپر ابھرے۔ یہی وہ اشعار ہیں جنھیں کمیونسٹ اپنے جلسوں اور جلوسوں میں گاتے ہیں اور ان سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اقبال بھی کمیونسٹ تھا۔ لیکن اقبال کمیونسٹ نہیں تھا، نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کمیونزم کے دو حصے ہیں۔ ایک تو ان کا یہ دعویٰ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کو سمیٹ کر اپنے قبضہ میں لے لے جبکہ غریب اور اس کے بچے بھوکوں مر رہے ہوں۔ جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے، اس کا ہر وہ مسلمان ہمنوا ہے جو قرآن سے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اقبال بھی اس کا ہمنوا تھا۔ اسے اس کا ہمنوا ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن دوسری چیز ہے کمیونزم کا وہ فلسفہ جس پر وہ اس دعوے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یعنی ہیگل کی جدلیت اور کارل مارکس کی تاریخ کی معاشی تعبیر۔ یہ وہ فلسفہ ہے جس کی تائید کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔ اور چونکہ اقبال مسلمان تھا اس لئے وہ اس فلسفہ کا سخت مخالف تھا چنانچہ وہ خواجہ غلام السیدین کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں (جو ۱۹۳۷ء میں لکھا گیا تھا) کہ :-

> سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں، اور اسے افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے یہ سیاسی مفہوم کا..... جو روحانیت میرے نزدیک مغضوب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے۔ اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے، جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال کارل مارکس کو "کلیم" تو کہتا ہے لیکن بے تجلی اور "مسیح" قرار دیتا ہے۔ لیکن بے صلیب۔ حتیٰ کہ وہ جاوید نامہ میں افغانیؒ کی زبان سے یہ کہلاتا ہے ؎

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است — قلبِ او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویندہ جانِ پاک را

دینِ آں پیغمبرِ ناحق شناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس

وہ کہتا ہے کہ جب روٹی کے مسئلہ کو خالص مادی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے انسان حیوانی سطح پر تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن اس کی انسانیت یکسر مردہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس قسم کی اشتراکیت ہو، یا مغرب کی ملوکیت، انسانیت کے حق میں دونوں کا نتیجہ ایک ہے ؎

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب — ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب

زندگی ایں را خراج آں را خراج — درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج

غرق دیدم ہر دو را در آب و گل — ہر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن باساختن
در گلے تخمِ دلے انداختن

یہی "سوختن باساختن" ہے جسے اقبال لَا اور اِلَّا سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روس کا اشتراکی نظام درحقیقت لَا کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی تمام کوششیں تخریبی ہی تخریبی ہیں۔ وہ "ساختن" یعنی اِلَّا (تعمیر) کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ "پس چہ باید کرد" میں روس کی اسی کشمکش کے بارے میں کہتا ہے ؎

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں — از ضمیرش حرفِ لَا آمد بروں

آں نظامِ کہنہ را برہم زداست — تیز نیشے بر رگِ عالم زداست

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ — لَا سلاطیں لَا کلیسا لَا الٰہ

فکر او در تند بادِ لَا بماند — مرکبِ خود را سوئے اِلَّا نراند

یہاں سے وہ تیسرا دائرہ شروع ہوتا ہے، جہاں اقبال اس اہم تقاضے کے متعلق قرآنی حل کو پیش کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے "سوختن اور ساختن" کے اصول کو لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ؎

نکتہ می گویم از مردانِ حال — اُمتاں را لَا جلال اِلَّا جمال

لَا و اِلَّا اضطرابِ کائنات — لَا و اِلَّا فتحِ بابِ کائنات

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون — حرکت از لَا زاید از اِلَّا سکون

در مقامِ لَا نیاساید حیات — سوئے اِلَّا می خرامد کائنات

لَا و اِلَّا ساز و برگِ اُمتاں — نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

لَا کے معنی ہیں ہر غلط نظام کو تباہ کر دینا۔ اور اِلَّا کے معنی ہیں اس کی جگہ ایک صحیح نظام قائم کرنا۔ یہ صحیح نظام صرف مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم کیا جا سکتا ہے، اور مستقل اقدار تنہا عقل کی رُو سے کبھی نہیں مل سکتیں۔ یہ اقدار صرف وحی کی رو سے مل سکتی ہیں اسلئے کہ

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر　　سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ　　در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اسی لئے اقبال نے افغانی کی زبانی (جاوید نامہ میں) روس کو یہ پیغام دیا تھا کہ ؎

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی　　دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردۂ کارِ خداونداں تمام　　بگزر از لا جانبِ اِلّا خرام
در گذر از لا اگر جوئندۂ　　تا رہِ اثبات گیری زندۂ
اے کہ می خواہی نظامِ عالمے　　جستۂ او را اساسِ محکمے؟

اقبال کے نزدیک نظامِ عالم کے لئے اس قسم کی محکم اساس قرآن کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نے روس سے کہا کہ ؎

داستانِ کہنہ شستی باب باب　　فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

اس کے بعد وہ کہتا ہے ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ　　دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو　　لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا
باسلماں گفت جاں برکف بنہ　　ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ

اقبال کو تخریبی قوت یا تخریبی پروگرام کی نامحکمی پر اس قدر یقین تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ روس زیادہ دیر تک تخریب کے گرداب میں رہ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں　　خویش را زیں تند باد آرد بروں

چنانچہ اقبال اپنے ایک خط میں جو انھوں سر فرانسس ینگ ہز بنڈ کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا (اور جو ۳۱ جولائی کے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں شائع ہوا تھا) لکھتے ہیں:-

ذاتی طور پر میں نہیں سمجھتا کہ روسی فطرۃً لامذہب ہیں۔ اسکے برعکس میرا خیال ہے کہ روسی عورتیں اور مرد بڑے مذہبی رجحانات رکھتے ہیں، اور روسی ذہن کا موجودہ منفی رجحان ہمیشہ باقی نہیں رہے گا کیونکہ کوئی عمرانی نظام دہریت کی اساس پر باقی نہیں رہ سکتا۔ جونہی اس ملک میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور اس کے باشندوں کو اطمینان سے غور کرنے کا وقت ملیگا وہ مجبوراً اپنے نظام کی کوئی مثبت بنیاد تلاش کریں گے چونکہ بالشویت کے ساتھ خدا کا قائل ہونا اور اسلام قریب ایک ہی چیز ہیں۔ اسلئے مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوگا، اگر کچھ زمانے

کے بعد روس اسلام کو ہضم کرے یا اسلام روس کو۔

لیکن اقبال ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ہمیشہ اسی انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ یورپ کا فلاں ملک مسلمان ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہو جائے اور ہماری بھی قسمت جاگ اٹھے۔ وہ مسلمانوں سے ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ تمہاری قسمت تمہارے اپنے ہاتھوں ہی سے بیدار ہوگی۔ لہٰذا اس نے مسلمانوں سے کہا کہ اس وقت زمانہ کے تقاضوں سے جو معاشی کشمکش پیدا ہو رہی ہے، تم اس کی روشنی میں قرآن پر غور کرو۔ اس سے قرآن تمہیں ایسی راہ نمائی دے دیگا جس سے نہ صرف یہ کہ تمہاری قسمت بیدار ہو جائیگی بلکہ تمام اقوامِ عالم کی قیادت تمہارے حصہ میں آجائے گی۔ چنانچہ وہ "ضربِ کلیم" میں کہتے ہیں کہ:-

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم ۔۔۔ بے سود نہیں روس کی یہ گرمیِ گفتار
اندیشہ ہوا شوخیِ افکار پہ مجبور ۔۔۔ فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر ۔۔۔ کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں ۔۔۔ اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک ۔۔۔ اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

چنانچہ جب خود اقبال نے زمانہ کے ان تقاضوں کی روشنی میں قرآن پر غور کیا تو اس کے سامنے یہ حقیقت آگئی کہ قرآن کی رُو سے رزق کے فطری سرچشموں پر کسی کی انفرادی ملکیت کا تصور یکسر باطل ہے۔ خدائے رب العالمین نے سامانِ رزق کو تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے عام کر رکھا ہے۔ اس لئے اسے اس مقصد کے لئے عام ہی رہنا چاہیئے۔ رزق کے سرچشمے زمین سے پھوٹتے ہیں۔ اس لئے زمین کے متعلق اقبال صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ ۔

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت ۔۔۔ ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر ۔۔۔ رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
باطنِ الارض للہ ظاہر است ۔۔۔ ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است
رزقِ خود را از زمیں بردن رواست ۔۔۔ ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خداست
آب و نانِ ماست از یک مائدہ ۔۔۔ دودۂ آدم کَنَفْسٍ وَّاحِدَہ

"بالِ جبریل" میں قرآن کی اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، جہاں لکھا گیا ہے کہ ۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ ۔۔۔ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ ۔۔۔ خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ ۔۔۔ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں ۔۔۔ تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

علامہ اقبالؒ پاکستان کا حصول بھی اسی مقصد کے لئے چاہتے تھے کہ یہاں خدا کے اس قانون کو رائج کیا جاسکے چنانچہ انہوں نے اپنی وفات سے صرف ایک سال پہلے قائد اعظم کے نام ایک خط میں لکھا کہ:-

> روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گزشتہ دو سو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جارہی ہے...... لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے...... شریعت اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہوسکتا ہے...... اسلام کے لئے سوشل ڈیموکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج، جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا...... ان مسائل کے حل کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد لازمی ہے۔

یعنی اقبالؒ کے نزدیک ایک الگ اسلامی مملکت کی ضرورت اس لئے تھی کہ یہاں قرآن کے معاشی نظام کا نفاذ کیا جاسکے جیسا کہ خود اقبالؒ کو اندیشہ تھا لیگ نے اس باب میں کچھ نہ کیا جس کا نتیجہ لیگ اور اس کے ساتھ سارا ملک بھگت رہا ہے۔

طلوعِ اسلام، قرآن کی اس انقلابی دعوت کو جسے اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا تھا، آگے بڑھاتا چلا جارہا ہے۔ مفاد پرستانہ مذہبیت کی طرف سے قرآن کی اس آواز کو دبانے کے لئے جو کچھ کیا جارہا ہے' اس سے کون واقف نہیں۔ وہ سادہ لوح مسلمانوں کو یہ کہہ کر بھڑکاتا ہے کہ جس قرآنی نظام کی طرف "طلوعِ اسلام" دعوت دیتا ہے' وہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے جس کا کچل دینا بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ وہ زمینداروں، جاگیرداروں اور سرمایہ پرستوں کو اطمینان دلاتا ہے کہ تمہارے لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں۔ بلا حد و نہایت رکھی جاسکتی ہے...... اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کرسکتے ہیں۔ اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے جائز دیئے ہوئے جائز حقوق

کو غصب کر لینے والی ہوں......... جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں، اور اتنی فلاں چیز، اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔

(مسئلہ ملکیت زمین از ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۵۲)

ہمیں خطرہ صرف یہ ہے کہ اگر اس وقت مسلمانوں نے قرآن کے ان حقائق کو اپنے معاشرہ کی بنیادیں قرار نہ دیا تو کمیونزم کا طوفانِ بدتمیزی نہ معلوم انھیں کہاں سے کہاں لے جائے۔ اسی خطرہ کے پیشِ نظر اقبال نے کہا تھا کہ

محفلِ ما بے مئے دبے ساقی است　　ساز قرآں را نوا ہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر　　آسماں دارد ہزاراں زخمہ در
حق اگر از پیشِ ما بردارد ش　　پیشِ قومے دیگرے بگذارد ش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن　　ہر زماں جانم بلرزد در بدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند　　آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

کس قدر دور رس تھیں اس مردِ حق آگاہ کی نگاہیں اور کیسا دردمند تھا اس مردِ مومن کا قلبِ حساس۔ کتنی محبت تھی اسے انسان اور مسلمان سے۔ اور کیسا عشق تھا اسے خدا کے کلام سے!

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

نظامِ ربوبیت

از۔ پرویز

نوعِ انسانی کا سب سے اہم اور مشکل سوال اس کا معاشی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا حل عقلِ انسانی نے کیا سوچا اور قرآن اس کا حل کیا بتاتا ہے۔ دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب۔ بڑا سائز ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قسم اول مجلد چھ روپے قسم دوم غیر مجلد چار روپے۔

۲۳ مارچ

اِسے اپنی زندگی کا ایک یادگار دن بنائیے

آج ہی فیصلہ کیجئے کہ زیادہ سے زیادہ کفایت اور پس اندازی سے کام لے کر اپنے اہل و عیال اور اپنی نئی جمہوریت کی آیندہ بہبود کے لئے روپیہ بچائیں گے۔ ہمیں اپنی نو عمر جمہوریت کی تعمیر کے لئے زیادہ سے زیادہ سرمایہ فراہم کرنا ہے۔ اسی پر ہماری آیندہ خوشحالی کا دار و مدار ہے

زیادہ سے زیادہ بچائیے اور سیونگ سرٹیفکیٹس خریدیے۔

اپنی بچت پوسٹ آفس سیونگ بنک میں جمع کرائیے۔

ڈاک خانے کی بیمہ پالیسی لیجئے۔

AFP. 5/57

UNITED

اقبال کے تصورات

(زندگی کے اہم مسائل کے متعلق)

۱۔ اجتہاد

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
اِن غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

(ضربِ کلیم)

۲۔ تخلیق

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
اس آبجو سے کیے بحرِ بیکراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کیے عمرِ جاوداں پیدا
خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں
ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا

(ضربِ کلیم)

۳۔ جدت

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں تیرے نورِ سحر سے

خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے سحر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی؟
(ضربِ کلیم)

۴۔ صاحبِ ایجاد

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ
(ضربِ کلیم)

۵۔ فنونِ غلاماں

بے یقیں را لذتِ تخلیق نیست بے یقیں را قوتِ تخلیق نیست
بے یقیں را عشہ ہا اندر دل است نقشِ نو آوردن او را مشکل است
از خودی دور است و رنجور است و پس رہبرِ او ذوقِ جمہور است و بس
(زبورِ عجم)

۶۔ مُلّا

دینِ حق از کافری رسوا تر است زانکہ مُلّا مومن کافر گر است
شبنم ما در نگاہِ مایم است از نگاہِ ادیم ما شبنم است
از شکر فیہائے آں قرآں فروش دیدہ ام روحِ الامیں را در خروش

زاں سوئے گردوں دلش بیگانۂ　　نزد او ام الکتاب افسانۂ
بے نصیب از حکمت دین نبی　　آسمانش تیرہ از بے کوکبی
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد　　ملت از قال و اقولش فرد فرد
مکتب و ملا و اسرار کتاب　　کور مادر زاد و نور آفتاب

دین کافر فکر و تدبیر جہاد
دین ملا فی سبیل اللہ فساد

(جاوید نامہ)

۷۔ بزبانِ ابلیس

نے حدیث و نے کتاب آوردہ ام　　جانِ شیریں از فقیہاں بردہ ام
رشتۂ دیں چوں فقیہاں کس نرشت　　کعبہ را کردند آخر خشت خشت

(جاوید نامہ)

۸۔ مسلمان کے لئے چار مرگ

چار مرگ اندر پے ایں دیر میر　　سود خوار و والی و ملا و پیر

(جاوید نامہ)

۹۔ مسلمانانِ فرنگی مآب

عالماں از علم قرآں بے نیاز　　صوفیاں درندہ گرگ و مو دراز
ہم مسلمانانِ افرنگی مآب　　چشمۂ کوثر بجویند از سراب
بے خبر از سرِ دین اند ایں ہمہ　　اہلِ کیں اند، اہلِ کیں اند، ایں ہمہ
گرگ ساں را رسم و آئین دیگر است　　سطوتِ پرواز شاہیں دیگر است

(جاوید نامہ)

۱۰۔ پاکستانی مسلمان

داستانِ او مپرس از من کہ من — چوں بگویم آنچہ ناید در سخن
در گلویم گریہ ہا گردد گرہ — ایں قیامت اندرونِ سینہ بہ
مسلم ایں کشور از خود نا امید — عمر ہا شد با خدا مردے ندید
لاجرم از قوتِ دیں بدظن است — کاروانِ خویش را خود رہزن است
پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق — مکتب و ملائے او محرومِ شوق
زشتیٔ اندیشہ او را خوار کرد — افتراقِ او را از خود بیزار کرد
تا نداند از مقام و منزلش — مرد ذوقِ انقلاب اندر دلش

(پس چہ باید کرد)

۱۱۔ اسکے پاس قرآن نہیں

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست — مصطفیٰ در سینۂ او زندہ نیست
بندۂ مومن ز قرآں برنخورد — در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد
خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقش از ملوکیت گرفت

(جاوید نامہ)

۱۲۔ متاعِ شیخ

متاعِ شیخ اساطیرِ کہن بود — حدیثِ او ہمہ تخمین و ظن بود
ہنوز اسلامِ او زنار دار است — حرم چوں دَیر بود او برہمن بود

(ارمغانِ حجاز)

۱۳۔ مُلّا

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را — بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند — کہ ملا کم شناسد رمزِ دیں را

(ارمغانِ حجاز)

۱۴۔ بندِ صوفی و مُلّا

بہ بندِ صوفی و ملا اسیری — حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست — کہ از یٰسینِ او آساں بمیری

(ارمغانِ حجاز)

۱۵۔ مغز و پوست

گرفتم حضرتِ ملا ترش روست — نگاہش مغز را نشناسد از پوست
اگر با ایں مسلمانی کہ دارم — مرا از کعبہ می راند حق اوست

(ارمغانِ حجاز)

۱۶۔ تاویلِ قرآں

ز من بر صوفی و ملا سلامے — کہ پیغامِ خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

(ارمغانِ حجاز)

۱۷۔ ملائے حرم

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو — تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال — تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام!

(ضربِ کلیم)

۱۸۔ فریب ہی فریب

چہ ملائی، چہ درویشی، چہ سلطانی چہ دربانی — فروغِ کار می جوید بسالوسی و زراقی

(زبورِ عجم)

۱۹۔ پیشوائیت

شیخِ شہر از رشتۂ تسبیح صد مومن بدام — کافرانِ سادہ دل را برہمن زنار تاب

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!!

واعظ اندر مسجد و فرزند او در مدرسہ — آں بہ پیری کودکے، ایں پیر در عہدِ شباب

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!!

(زبورِ عجم)

۲۰۔ نخلِ بے ثمر

شنیدہ ام سخنِ شاعر و فقیہ و حکیم — اگرچہ نخلِ بلند است برگ و بر ند ہد

(زبورِ عجم)

۲۱- اشتراکیت

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل!
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است — قلبِ او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک — جز بتن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخِ او در دل نہ در آب و گِل است

(جاوید نامہ)

۲۲- روس کا تجربہ

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ — بندگی با خواجگی آمد بجنگ
روس را قلب و جگر گردیدہ خوں — از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است — تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ — لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ
فکرِ او در تندبادِ لا بماند — مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں — خویش را زیں تندباد آرد بروں
در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا سازو برگِ اُمتاں — نفیِ بے اثبات مرگِ امتاں
در محبت پختہ کے گردد خلیل — تا نگردد لا سوئے اِلّا دلیل
اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن — نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن
ایں کہ می بینی نیرزد با دو جو — از جلالِ لا الٰہ آگاہ شو
ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لا ست — جملہ موجودات را فرماں رواست

(پس چہ باید کرد)

۲۳۔ الارض للہ

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت — ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر — رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
باطنِ الارض للہ ظاہر است — ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست — ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست
بندۂ مومن امیں، حق مالک است — غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

اے کہ می گوئی متاعِ ما ز ماست — مردِ ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست
ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو — چیست شرحِ آیۂ لا تفسدوا
ابنِ آدم دل بابلیسی نہاد! — من ز ابلیسی ندیدم جز فساد
کس امانت را بکارِ خود نبرد — اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپرد
بردۂ چیزے کہ از آنِ تو نیست — داغم از کارے کہ شایانِ تو نیست
گر تو باشی صاحبِ شے می سزد — ور نباشی، خود بگو کے می سزد
ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ — تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ
زیرِ گردوں فقر و مسکینی چراست — آنچہ از مولاست می گوئی ز ماست
بندۂ کز آب و گل بیروں نجست — شیشۂ خود را بسنگِ خود شکست
اے کہ منزل را نمی دانی ز رہ — قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگہ
تا متاعِ تست گوہر گوہر است — ورنہ سنگ است از شررے کمتر است
نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود — ایں زمین و آسماں دیگر شود

(جاوید نامہ)

۲۴۔ مثالی معاشرہ

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش — خوب روئے و نرم خوئے و سادہ پوش

فکر شاں بے درد و سوزِ اکتساب　　رازدانِ کیمیائے آفتاب
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر　　کارہا را کس نمی سنجد بزر
کس ز دینار و درم آگاہ نیست　　ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست
سخت کش دہقاں، چراغش روشن است　　از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاعِ آبجوست　　حاصلش بے شرکتِ غیرے از دست
اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں　　نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مرغدیں گیرد فروغ　　از فنِ تحریر و تشہیرِ فروغ
نے بہ بازاراں ز بیکاراں خروش　　نے صداہائے گدایاں در دو گوش

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

(جاوید نامہ)

۲۵۔ حاصلِ مملکتِ اسلامیہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

(جاوید نامہ)

۲۶۔ ابلیس کی زبان سے

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں　　ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں　　بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف　　ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر!　　حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے　　نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتی ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

(ارمغانِ حجاز)

۲۷۔ حرفِ آخر

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

دُرِّ منثور

اُن موتیوں میں سے چند جو اقبال کے مکتوبات و دیگر تحریرات نثریہ میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔

داخلی انقلاب

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔

(دیباچہ پیامِ مشرق)

نسل پرستی

تاریخِ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب وحدتِ انسانیت کے لئے دقیانوسی اصول مثلاً خونی رشتے اور تخت و تاج کے علائق ناکام ہو چکے تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک وحدتِ انسانیت کا اصول گوشت پوست سے متعلق نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ انسانی قلب میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مٹا دو، ورنہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہ ہوگا کہ اسلام فطرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مخصوص اداروں سے ایسے نقطۂ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو فطرت کے نسل ساز قوی کو بیکار کر دے۔ انسانوں کے سدھارنے کے لئے اسلام نے ایک ہزار سال میں جو کچھ کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔

(احمدیت سے متعلق۔ نہرو کے جواب میں)

قومیت

اسلام کا مذہبی نصب العین اس معاشری نظام سے ناقابلِ شکست طریق سے وابستہ ہے جسے اس نے تشکیل کیا ہے یہاں

تک کہ ایک کا انکار دوسرے کے انکار کو مستلزم ہے۔ لہٰذا قومی خطوط پر کسی ہیئتِ اجتماعیہ کا قیام اسلامی اصول وحدت کا نقیض ہے۔ کوئی مسلمان اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

مذہب اور سیاست

اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اسکے قومی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ قدیم زمانے میں دین قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا، بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے نبی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی۔ نہ انفرادی ہے نہ پرائیویٹ۔ بلکہ خالصتہً انسانی ہے۔ اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے، عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے، جو ایک امت کی تشکیل اور اسکی بقا کے لئے ضروری ہے۔

(حسین احمد مدنی کے جواب میں بیان)

شریعت کا مقصود

اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود معین کرتا ہے۔ ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

دورِ انحطاط کے پیشوا

اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی سوتیں خشک ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان کا زوال بجائے خود ان کے شعراء فلاسفہ۔ سائنٹسٹ وغیرہم کو ایک نئی تحریکِ خیال سے ابھارتا ہے۔ چنانچہ وہ پیغمبرانہ شان سے اٹھتے ہیں اور استدلال کے گورکھ دھندے تیار کر کے حیاتِ ملی کے رذائل و ذمائم کے گیت گاتے اور انھیں خوش آیند و درخشاں بناتے ہیں۔ یہ پیغمبر غیر شعوری طور پر قنوطیت کو رجائیت کے بھیس فریب لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اہلِ قوم کے عملی قویٰ کو شل اور ان کی روحانی قوتِ نمو کو یکسر فنا کر دیتے ہیں۔

(بیان متعلقہ احمدیت)

مجوسی کلچر

جب کسی کلچر میں علاماتِ زوال نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو اس کی فلسفیانہ بحثیں، اس کے تصورات اور اس کے واردات روحانی کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی کلچر ایسے ہی دور سے گذر رہی تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ جہاں تک میں تاریخ کلچر کا مطالعہ کر سکا ہوں۔ اسلام نے مجوسی کلچر کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ قرآن میں بیّن ثبوت اس امر کے ملتے ہیں کہ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دے بلکہ واردات و کیفیاتِ روحانی کی تشکیلِ نو کرے۔ لیکن ہمارے مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کر دیں اور اسکی روح کی نشوونما اور اسکے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

(احمدیت سے متعلق ـــــ اخبار لائٹ کے جواب میں)

اسلام پر نازک وقت

اسلام اس وقت زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۳۵ء)

قرآن کی کاملیت

ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں۔

(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط ۱۹۳۵ء)

دورِ حاضر کا مجدد

میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس (اصولِ فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد ہوگا۔ اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔

(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۳۵ء)

محاورۂ عرب

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے۔ اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معانی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں

ہرگز نہیں۔ (سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

ملت کی حالت

اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ علماء میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کو کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیا اسلام سے بے پرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں۔

(چودھری نیاز علی خاں کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

نازک وقت

مسلمانوں پر اس وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آرہا ہے۔ جس کی ابتدا یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی۔ مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہ نما نہیں ہے اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں۔ نہ عامۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاح لوتھر نے مسیحیت کے لئے کیا کیا نتائج پیدا کئے ہیں۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

اضطراب

میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۲۶ء)

فکر سے محرومی

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

لیڈروں کا فقدان

اس وقت (ہندوستان کے) مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض ان قائدین کا فقدان ہے جو اسلام کی روح اور تقدیر

کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں۔ اور تاریخ جدید کے میلانات پر بھی ان کی نگاہ ہو۔ ایسے اشخاص ہی قوموں کی قوتِ محرکہ ہوتے ہیں لیکن وہ خدا کی دین ہوتے ہیں اور ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرا مرض احساسِ اجتماعیت کا فقدان ہے۔ اس سے افراد اور گروہ اپنی جداگانہ راہیں تلاش کر رہے ہیں اور عمومی فکرِ اجتماعی حرکت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔ اس وقت ہم سیاست میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو مذہب میں صدیوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مذہبی تفرقہ بازی قومی وحدت کو زیادہ نقصان نہیں پہنچاتی کیونکہ مذہبی فرقے اس حد تک باغی نہیں ہو جاتے کہ اسلام سے ہی منحرف ہو جائیں۔ لیکن سیاسی انتشار بالخصوص ایسے نازک وقت میں کہ ملت کا اجتماعی مفاد اتحادِ عمل کا متقاضی ہو، مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

احترامِ آدمیت

انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ (ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

وحدتِ انسانیت

قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے۔ جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

قومیت سے بلند

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید و تخلیق ہو قابلِ احترام ہے۔

(دیباچہ پیامِ مشرق)

وطنیت

میں یورپی تصورِ وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کم تر مادی فوائد حاصل ہوں گے بلکہ اس لئے کہ اس میں منکرِ خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں جسے میں جدید انسانیت کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

مسلم لیگ کے لئے فیصلہ

مسلم لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ بدستور سابق مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی تک محدود رہیگی یا مسلمان عوام کی نمائندگی کی بھی کرے گی۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ جو سیاسی جماعت عام مسلمانوں کا درجہ بلند کرنے کی داعی نہیں وہ عوام میں کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔

(قائداعظم کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

لیگ کا مستقبل

آئین کے مطابق اعلیٰ عہدے امراء کی اولاد کے لئے وقف ہیں اور نچلے درجے کے عہدے وزیروں کے دوستوں اور رشتہ داروں کا حصہ ہیں۔ دیگر امور میں ہمارے سیاسی اداروں نے عامۃ المسلمین کا عمومی درجہ بلند کرنے کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ پیٹ کا مسئلہ دن بدن لاینحل ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ دو سو سال سے ذلیل سے ذلیل تر ہوتا جا رہا ہے۔ حال یہ ہے، مسلمان کے افلاس کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے۔ لیگ کا سارا مستقبل اس مسئلہ کے حل پر منحصر ہے۔ اگر لیگ اس مسئلہ کے حل سے قاصر رہی تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے دُور رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اس کا حل اسلامی آئین کی تنفیذ میں ہے۔ طویل غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس طرز آئین کو کماحقہٗ سمجھ کر نافذ کر دیا جائے۔ تو کم از کم ہر ایک کا حق معیشت تو محفوظ ہو جاتا ہے موجودہ زمانے کے پیدا کردہ مسائل کا حل ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے زیادہ آسان ہے۔

(قائداعظم کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

مغربی سیاست

جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی۔ وہ خونریزی۔ سفاکی۔ کمزوری اور ظلم کے دیوتا ثابت ہوئے جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں۔ انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں۔ انھوں نے ملوکیت و استعمار کے جوش میں لاکھوں۔ کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچائے۔

(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

تاریک ترین دَور

اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت۔ اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدر حریت اور شرف انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا

کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔

(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

قوانین الٰہیہ کی اتباع

جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو۔ امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

انحطاط کا جادو

انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا شکار اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

ایرانی اثرات

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم سے ہوئی۔

(منشی سراج الدین کے نام خط۔ ۱۹۱۵ء)

تصوف

تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانہ میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا جس قوم میں توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی پستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقا میں ہو چھپایا کرتی ہیں ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔

(سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

تصوف کا وجود سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۱۷ء)

جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے۔ تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔

(علامہ اسلم جیراجپوری کے نام خط ۱۹۱۹ء)

ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفۂ وحدانیت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت (SUBTLE) طریق تمسخ کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شاعر ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبع موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح ظاہر ہوا یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تمسخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو مذموم بیان کیا ہے۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

ابن عربی

تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔

(سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

تصوف اور امامت

میں نے کئی دفعہ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ صوفی بننے کی نسبت شیعہ ہو جانا ضروری ہے۔ اگر تقلید ضروری ہو تو اولاد علی مرتضیٰؓ سے بڑھ کر اور کون امام ہوگا۔ البتہ امامت کے اصول میں ایک نقص ہے اور وہ یہ کہ عوام کو مجتہدین سے تعلق رہتا ہے اور قرآن سے تعلق کم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بالکل کوئی تعلق نہیں رہتا۔

(اکبر الہ آبادی کے نام خط ۱۹۱۵ء)

خوئے غلامی

جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوت نفس اور روح انسانی کا ترفع ہو۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

قرآن کا مسلک

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۳۲ء)

شاعری

میرے زیر نظر حقائق اخلاقی دلی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ فن شعر سے بھی بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔

(پروفیسر شجاع کے نام خط۔ ۱۹۳۱ء)

شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۱۹ء)

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے میرا کوئی رقیب نہیں۔ اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں۔ جن کے بیان کے لئے ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست — کہ بر من تہمت شعر و سخن ست

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب آرہا ہے اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ یہ احکام سورۂ بقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں۔

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

(۱) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔

(۲) أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ

(۲) یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

(۳) فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

(۳) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

(۴) وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ

(۴) اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ان کے لئے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

(۵) فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ۔

(۵) اس کے بعد بھی اگر کوئی اپنی خوشی سے زیادہ کرے تو مزید اجر کا موجب ہوگا۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ.....

(۶) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے.....

(۷) فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ.....

(۷) لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کر دے.....

(۲ / ۱۸۳-۱۸۵)

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ

(۱) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں۔ پورے مہینے کے)

(۲) روزے اسکے لئے ہیں کہ جو اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

(۳) اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہو اور نہ مسافر ہے لیکن کسی وجہ سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔ ایسے لوگوں کا حکم نمبر ۳ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انھیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں وہ روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلادیں۔

غور فرمایئے اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے "وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ" کا ترجمہ ــــ "وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں" کیا ہے۔ حالانکہ اس کا عام ترجمہ ــــ "اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں" ــــ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اسلئے کہ اس ترجمہ کی رُو سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا منشا یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں رائج ہے وہ اس مفہوم سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ ہمارے مترجمین نے عربی کے لفظ "طاقت" کا ترجمہ اردو کے لفظ طاقت سے کر دیا اور دونوں زبانوں کے مفہوم میں جو فرق تھا اسے نظر انداز کر گئے۔ عربی زبان میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھیئے۔ محیط المحیط جلد دوم صـ ۱۳۰۴ میں ہے۔

> طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں۔ لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں جسے انسان بمشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے کا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجا لانا ہمیں دشوار ہو۔

اسی طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب صـ ۱۰۳ ج ۱۲ میں ہے کہ

> طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بمشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار صـ ۱۵۵ ج ۲ پر فرماتے ہیں کہ

> اِطَاقَةٌ دراصل مُکْنَتٌ اور قُدْرَتٌ کے بالکل ادنٰے درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب اَطَاقَ الشَّيْئَ صرف اس وقت کہتے ہیں جب اسکی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو۔ یعنی بدشواری کہ اسے برداشت کر سکتا ہو۔ چنانچہ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد بوڑھے ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور وہ لوگ ہیں جو ان ہی کی طرح معذور ہوں۔ یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پُرمشقت کاموں میں رکھدی ہے ...... اسی بنا پر امام راغب نے لکھا

ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بہ مشقت ممکن ہو۔

اسی کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ۔

طَاقَۃٌ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جا سکے اور وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت ثابت ہے منسوخ نہیں ہے (تفسیر کشاف صفحہ ۲۵۵ ج ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ

عربی زبان میں "اَلْوُسْعُ" کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور "طَاقَۃٌ" کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا (آیۃ زیر نظر کے) معنی یہ ہوں گے "اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔۔۔۔۔۔

(روح المعانی صفحہ ۵۹ ج ۲)

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ "طَاقَۃٌ" کا مفہوم کیا ہے۔ اور اس بنا پر وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ کا ترجمہ ــــ "اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں" ــــ کر دینا کس قدر غلط فہمیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا ترجمہ ــــ "اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں" ــــ کیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کر لے۔ چنانچہ "عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ" میں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب جامع احکام القرآن (صفحہ ۲۶۸-۲۶۹ ج ۲) میں ہے کہ

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں۔ البتہ امام مالکؒ نے اتنا کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں تو یہ میرے نزدیک پسندیدہ ہے اور حضرت انسؓ۔ ابن عباسؓ۔ قیس بن السائب اور ابوہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے (حنفیہ) امام احمدؒ اور امام اسحقؒ کا قول بھی یہی ہے۔ نیز ابن عباسؓ کی ایک روایت ہے کہ انہوں نے اپنی ام ولد سے فرمایا جو

حاملہ تھی یا بچہ کو دودھ پلا رہی تھی کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں لہٰذا تیرے ذمہ فدیہ ہے قضا نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اس فہرست میں اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

اَلَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ سے یہاں مراد بوڑھے۔ ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی انہی کے زمرہ میں شمار ہوں گے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خدا نے پر مشقت کاموں میں رکھدی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے۔ اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہوں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو..... تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جس کے دور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو روزہ رکھنا گراں گذرتا ہو جیسے بڑھاپا۔ اور پیدائشی کمزوری۔ اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت۔ اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہو۔ جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔

(تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵-۱۵۷ ج ۲)

ان تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔

(۱) بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت

(۲) حاملہ عورتیں

(۳) دودھ پلانے والی عورتیں۔

(۴) اپاہج اور معذور لوگ

(۵) پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی کوئی امید نہ ہے۔

(۶) ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (Constitutionally) کمزور ہی پیدا ہوئے ہوں۔

(۷) وہ مزدوری پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پُر مشقت کاموں میں ہوتی ہے۔ مثلاً کانوں میں کام کرنے والے اور کارخانوں میں کام کرنے والے۔ یا رکشہ چلانے والے۔

(۸) وہ مجرم جن سے جیل خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بہ حالاتِ موجودہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اصول یہی ہے کہ جو شخص بہ مشقت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

آپ غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کے معاملہ میں انسان کی طبعی حالت کی کس قدر رعایت رکھی تھی۔ لیکن ہمارے علمائے کرام نے اس رعایت کو منسوخ کر کے کس قدر دشواریاں پیدا کر دی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے تھے وہ یا تو روزے رکھ رکھ ایسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو بعض ان کی جان تک لے لیتی ہیں۔ یا روزے نہ رکھ کر چوروں کی طرح چھپے چھپے پھرتے ہیں۔ یا علانیہ خدا اور اس کے دین کے خلاف بغاوت پہ اُتر آتے ہیں۔ یہ ہے فرق خدا کی طرف سے عطا کردہ دین اور ملّا کے خودساختہ مذہب میں۔ اس کے متعلق ہم تفصیل سے طلوع اسلام کی اکتوبر ۵۲ء کی اشاعت میں لکھ چکے ہیں (اس مضمون کو بعد میں ادارہ کی طرف سے شائع شدہ کتاب "مزاج شناس رسول" میں شامل کر دیا گیا تھا) جو حضرات اس تفصیل کو دیکھنا چاہیں وہ وہاں دیکھ لیں۔

بہرحال، یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآن کریم میں دیکھ لیں (یعنی سورۂ بقرہ۔ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸) ہم نے اس مقام پر صرف احکام کی وضاحت کی ہے۔ روزوں کی حکمت سے بحث نہیں کی کیونکہ وہ الگ موضوع ہے۔

نوٹ فرمالیجئے

دفتر طلوعِ اسلام کا پتہ

خط و کتابت کیلئے

۳/۱۵۹۔ ایل۔ (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی ۲۹

دفتر آنیوالے حضرات کے لئے

جمشید روڈ سے جیل کے سامنے پہنچکر دائیں طرف جیل کی دیوار کے ساتھ ساتھ اسلام آباد کے چوک میں آنا چاہیے۔ وہاں طلوع اسلام کا بورڈ لگا ہوا ہے جو دفتر کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ کراچی صدر سے اسلام آباد چوک کے لئے بس ۲۷، ۳۷ اے۔ ۲۶ اور ۴۳ اے سے سفر کیجئے۔ اور اگر جمشید روڈ پر (جیل کے سامنے) اترنا چاہیں تو اسکے لئے اور بہت سی بسیں مل جائیں گی۔

اگر کوئی دقت ہو تو ۴۱۴۸۸ پر ٹیلیفون کیجئے۔

طلوع اسلام اور دیگر مطبوعات کی
پوسٹنگ کی تاریخیں

ہر ماہ کی ۳ — ۱۰ — ۲۰ — ۳۰ ہیں۔ طلوع اسلام عام طور پر مقررہ تاریخ کو پوسٹ کر دیا جاتا ہے۔ طلوع اسلام یا اس کا لٹریچر طلب کرنیوالے حضرات آرڈر بھیجنے یا شکایتی خطوط لکھنے کے بعد بے تابانہ طور پر پرچہ اور کتابوں کا انتظار شروع کر دیتے ہیں۔ ان کو ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ پرچہ اور کتابیں ان تاریخوں ہی میں بھیجی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا اپنا آرڈر یا شکایت تحریر کرنے کے بعد ان تاریخوں کو ذہن میں رکھیئے اور خواہ مخواہ ادارہ پر ناراض نہ ہوجیئے۔

ہماری مجبوریاں

"برق طور" اور "طاہرہ" کے نام ہر دو کتابوں کی کاپیاں دو ماہ سے پریس میں ہیں۔ خدا خدا کر کے "برق طور" چھپ گئی ہے اور اب وہ جلد ساز کے ہاں ہے۔ مگر "طاہرہ" کے نام اب تک نہیں چھپ سکی۔ توقع ہے کہ اپریل کے مہینہ میں اسکی دونوں جلدیں چھپ کر تیار ہو جائیں گی۔ بہرحال احباب کو ان کتابوں کے لئے کافی عرصہ تک زحمت کش انتظار رہنا پڑا اس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

قانونِ شریعت

علامہ اقبالؒ کے چھٹے لیکچر کا آزاد ترجمہ (معہ تشریحی نوٹس اور تعارفی شذرات) جو اس اشاعت میں شامل ہے پمفلٹ کی صورت میں علیحدہ بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ مقالہ نہایت اہم ہے اور اس کی عام تقسیم و اشاعت بڑی ضروری ہے۔ اسکی ضخامت (۳۲ صفحات) کے پیش نظر اسے محدود تعداد میں شائع کیا جا رہا ہے۔ خواہشمند حضرات جلد طلب فرمالیں۔

قیمت فی کاپی ۴ر

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

قرآنی انقلاب کا صحیح تصوّر

اِن کتابوں سے پیدا ہو سکے گا

معراج انسانیت حضور صلعم کی ذات اقدس و اعظم شرف و مجد انسانیت کے کس بلند مقام پر فائز تھی۔ اسے قرآن کے آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ سیرت مقدسہ کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ مضبوط دوہری جلد۔ قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم سب سے پہلا انسان کس طرح پیدا ہوا تھا؟ جنات ملائکہ۔ وحی۔ شیطان اور ابلیس جیسے اہم مباحث کے لئے سلسلہ معارف القرآن کی اس پہلی کڑی کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ بڑا سائز ۳۷۶ صفحات۔ مجلد قیمت آٹھ روپے۔

جوئے نور کاروان نبوت کے درخشندہ ستاروں یعنی حضرات انبیائے کرام از حضرت نوحؑ تا حضرت شعیبؑ کے تذکار جلیلہ پر تفصیلی کتاب سلسلہ معارف القرآن کی دوسری کڑی۔ سائز ۲۹×۲۲/۸ ۳۶۸ صفحات قیمت مجلد چھ روپے

انسان نے کیا سوچا؟ زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لئے انسانی فکر نے کیا کیا کوششیں کیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ بیش بہا معلومات کا ذخیرہ۔ سائز ۲۹×۲۲/۸ ۳۶۸ صفحات۔ قیمت دس روپے

سلیم کے نام خطوط مذہب کے متعلق نوجوان تعلیمیافتہ طبقہ کے دل میں جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ اور شاداب جواب۔ بڑا سائز ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

فردوس گم گشتہ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیمیافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا ہے اور فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ کتاب بڑا سائز ۴۱۲ صفحات۔ قیمت چھ روپے

نظام ربوبیت نوع انسانی کا سب سے اہم اور مشکل سوال اس کا معاشی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا حل عقل انسانی نے کیا کیا اور قرآن اس کا حل کیا بتاتا ہے۔ دور حاضرہ کی عظیم کتاب۔ بڑا سائز ضخامت ۳۰۰ صفحات قیمت قسم اول مجلد چھ روپے۔ قسم دوم غیر مجلد چار روپے۔

اسباب زوال اُمّت (دوسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری نکبت و زوال کے اسباب کیا ہیں اور ان کا علاج کیا۔ ۱۷۲ صفحات۔ قیمت دو روپے

(یہ تمام کتابیں محترم پرویز صاحب کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہیں)

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۳/۱۵۹-ایل (پی۔ای۔سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹

تازہ پھلوں سے تیار کردہ
عبدالحنان
کے
خوش ذائقہ
اور
فرحت بخش
مشروبات
جام
جیلی
چٹنی
مربہ جات
وغیرہ
اے۔ ایچ۔ فوڈ انڈسٹریز کراچی
فون: ۳۳۹۱۲

DURA-GLOSS
Nail Polish
MADE IN U.S.A.
دُورا جلوس
ناخون کی پالش
تزئین حُسن کے لئے
ناخون کی آرائش ضروری ہے
دُورا جلوس
خوش رنگ۔ دیدہ زیب۔ چمکدار اور
خوشبودار پالش ہے۔
امریکہ میں بنی ہوئی
ہر بڑے دوکاندار سے ملتی ہے

سب کی پسند
مسواک
MISWAK
MAKES
TEETH
PEARLY
WHITE

چھوٹا مسواک ٹوتھ برش

Hashmi

دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے

چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک

نایاب تحفہ ہے

جو نرم و نازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور

جس کا استعمال بچوں کیلئے مفید ترین مشغلہ ہے